زیر سرپرستی

جاوید احمد غامدی

ماہنامہ اشراق

ریاست ہائے متحدہ امریکہ

دسمبر 2024ء

مدیر: سید منظور الحسن

اشراق آڈیو

مدیر آڈیو: محمد حسن الیاس

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

ماہنامہ
اشراق
امریکہ
ریاست ہائے متحدہ

جلد ۲ شمارہ ۱۲ دسمبر ۲۰۲۴ء جمادی الثانی / رجب ۱۴۴۶ھ

زیر سرپرستی
جاوید احمد غامدی

مدیر
سید منظور الحسن

مدیر آڈیو اشراق: محمد حسن الیاس

معاون مدیر: شاہد محمود

مجلس تحریر:
ریحان احمد یوسفی، ڈاکٹر عمار خان ناصر، ڈاکٹر محمد عامر گزدر
ڈاکٹر عرفان شہزاد، محمد ذکوان ندوی، نعیم بلوچ

فہرست

شذرات

دین میں علم و استدلال کے بنیادی اصول — سید منظور الحسن — 3

قرآنیات

البیان: البقرہ 2: 216-223 (16) — جاوید احمد غامدی — 6

معارف نبوی

احادیث — جاوید احمد غامدی / محمد حسن الیاس — 9

مقامات

نیا فتنہ — جاوید احمد غامدی — 11

www.ghamidi.org

غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، المورد امریکہ

دین و دانش

شق القمر: غامدی صاحب کا موقف (17)	سید منظور الحسن	13

آثارِ صحابہ

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا علم و عمل بہ طور اسوہ (3)	ڈاکٹر عمار خان ناصر	20

نقطۂ نظر

شورائیت اور ملوکیت	ڈاکٹر عرفان شہزاد	29

مختارات

اخلاص	مولانا امین احسن اصلاحی	36
قرآن وسنت کا باہمی تعلق	ڈاکٹر عمار خان ناصر / ڈاکٹر سید مطیع الرحمٰن	41
'اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ' کی شان نزول کی تحقیق (1)	علامہ شبیر احمد ازہر / غطریف شہباز ندوی	53
دعوت میں احترام راے کی اہمیت	نبیل اشفاق	59

تراجم

الإیمان باللہ	غطریف شہباز ندوی	62

سیر و سوانح

حیاتِ امین (16)	نعیم احمد بلوچ	72

ادبیات

اٹھ کہ یہ سلسلۂ شام و سحر تازہ کریں	جاوید احمد غامدی	81

حالات و وقائع

پاکستان، امریکہ اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ (5)	محمد حسن الیاس / رانا معظم صفدر	82
خبر نامہ "المورد امریکہ"	شاہد محمود	86

اٹھ کہ یہ سلسلۂ شام وسحر تازہ کریں
عالمِ نو ہے، ترے قلب ونظر تازہ کریں

سید منظور الحسن

دین میں علم و استدلال کے بنیادی اصول

دین کے جملہ مباحث میں علم و استدلال کے لیے دو اصولوں کو بنیادی حیثیت حاصل ہے۔ یہ عقل و نقل کے مبادیات ہیں، جنھیں اختیار کیے بغیر دین و شریعت کے صحیح فہم تک رسائی ممکن نہیں ہے۔ یہ درج ذیل ہیں:

اول، دین میں قرآنِ مجید کی حیثیت میزان اور فرقان کی ہے۔[1] اِس کے معنی یہ ہیں کہ دین سے متعلق تمام معاملات میں اِسے فیصلہ کن حیثیت حاصل ہے۔ چنانچہ احادیث و آثار، تاریخ و سیرت، فقہ و تفسیر کے ہر قول، ہر روایت اور ہر راے کو اِس کی ترازو میں تولا جائے گا اور اِس کی کسوٹی پر پرکھا جائے گا۔ وہی چیز قابل قبول ہو گی، جسے یہ قبول کرے گا۔ جسے یہ رد کرے گا، اُسے

---

[1] ۔ اَللّٰهُ الَّذِيْٓ اَنْزَلَ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ وَالْمِيْزَانَ. (الشوریٰ 42:17)

”اللہ ہی ہے، جس نے اپنی یہ کتاب قول فیصل کے ساتھ اتاری ہے اور (اِس طرح حق و باطل کو الگ الگ کرنے کے لیے) اپنی میزان نازل کر دی ہے۔“

تَبٰرَكَ الَّذِيْ نَزَّلَ الْفُرْقَانَ عَلٰى عَبْدِهٖ لِيَكُوْنَ لِلْعٰلَمِيْنَ نَذِيْرًا. (الفرقان 25:1)

”بہت بزرگ، بہت فیض رساں ہے وہ ذات جس نے اپنے بندے پر یہ فرقان اتارا ہے، اِس لیے کہ وہ اہل عالم کے لیے خبر دار کرنے والا ہو۔“

دین یا اُس کی شرح و وضاحت کی حیثیت سے قبول نہیں کیا جائے گا۔

اِس اصول پر عمل کے لیے ضروری ہے کہ حدیث کو قرآن کی روشنی میں سمجھا جائے اور اِس میں اگر کوئی چیز قرآن و سنت کے خلاف ہو تو اُسے قبول نہ کیا جائے۔ ''میزان'' میں ہے:

''... دین میں قرآن کی حیثیت میزان اور فرقان کی ہے۔ وہ ہر چیز پر نگران ہے اور حق و باطل میں امتیاز کے لیے اُسے حکم بنا کر اتارا گیا ہے، لہٰذا یہ بات تو مزید کسی استدلال کا تقاضا نہیں کرتی کہ کوئی چیز اگر قرآن کے خلاف ہے تو اُسے لازماً رد ہونا چاہیے۔... نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی حیثیت نبوت و رسالت میں جو کچھ کیا، اُس کی تاریخ کا حتمی اور قطعی ماخذ بھی قرآن ہی ہے۔ لہٰذا حدیث کے بیش تر مضامین کا تعلق اُس سے وہی ہے، جو کسی چیز کی فرع کا اُس کی اصل سے اور شرح کا متن سے ہوتا ہے۔ اصل اور متن کو دیکھے بغیر اُس کی شرح اور فرع کو سمجھنا، ظاہر ہے کہ کسی طرح ممکن نہیں ہوتا۔ حدیث کو سمجھنے میں جو غلطیاں اب تک ہوئی ہیں، اُن کا اگر دقت نظر سے جائزہ لیا جائے تو یہ حقیقت صاف واضح ہو جاتی ہے۔ عہدِ رسالت میں رجم کے واقعات، کعب بن اشرف کا قتل، عذاب قبر اور شفاعت کی روایتیں، 'أمرت أن أقاتل الناس'[2] اور 'من بدل دینه فاقتلوه'[3] جیسے احکام اِسی لیے الجھنوں کا باعث بن گئے کہ اُنھیں قرآن میں اُن کی اصل سے متعلق کر کے سمجھنے کی کوشش نہیں کی گئی۔''(63-65)

دوم، قرآنِ مجید صاف اور واضح عربی زبان میں نازل ہوا ہے۔ اِس کے الفاظ و اسالیب میں کوئی الجھاؤ، کوئی ابہام، کوئی شذوذ اور کوئی غرابت نہیں ہے۔ یہ اپنا مدعا پوری صراحت کے ساتھ پیش کرتا ہے، جسے اہل علم کو سمجھنے میں کوئی دشواری پیش نہیں آتی۔

''میزان'' میں بیان ہوا ہے:

''قرآن صرف عربی ہی میں نہیں، بلکہ عربی مبین میں نازل ہوا ہے۔ یعنی ایک ایسی زبان میں جو نہایت واضح ہے، جس میں کوئی اینچ پینچ نہیں ہے، جس کا ہر لفظ صاف اور جس کا ہر اسلوب اپنے مخاطبین کے لیے ایک مانوس اسلوب ہے۔ ارشاد فرمایا ہے:

---

[2]۔ بخاری، رقم 25۔ مسلم، رقم 129۔ ''مجھے حکم دیا گیا ہے کہ میں اِن لوگوں سے جنگ کروں۔''

[3]۔ بخاری، رقم 3017۔ ''جو اپنا دین تبدیل کرے، اُسے قتل کر دو۔''

نَزَلَ بِهِ الرُّوْحُ الْاَمِيْنُ. عَلٰى قَلْبِكَ لِتَكُوْنَ مِنَ الْمُنْذِرِيْنَ. بِلِسَانٍ عَرَبِيٍّ مُّبِيْنٍ. (الشعراء26:195-193)

”اِس کو روح الامین لے کر اترا ہے۔ تمھارے دل پر، اِس لیے کہ دوسرے پیغمبروں کی طرح تم بھی خبردار کرنے والے بنو۔نہایت صاف عربی زبان میں۔“

قُرْاٰنًا عَرَبِيًّا غَيْرَ ذِيْ عِوَجٍ لَّعَلَّهُمْ يَتَّقُوْنَ. (الزمر39:28)

”ایسے قرآن کی صورت میں جو عربی زبان میں ہے، جس کے اندر کوئی ٹیڑھ نہیں ہے، اِس لیے کہ وہ خدا کے عذاب سے بچیں۔“

قرآن کے بارے میں یہ ایک واضح حقیقت ہے۔اِسے مانیے تواِس کے لازمی نتیجے کے طور پر یہ بات تسلیم کرنا پڑتی ہے کہ قرآن کا کوئی لفظ اور کوئی اسلوب بھی اپنے مفہوم کے اعتبار سے شاذ نہیں ہو سکتا۔ وہ اپنے مخاطبین کے لیے بالکل معروف اور جانے پہچانے الفاظ اور اسالیب پر نازل ہوا ہے۔ زبان کے لحاظ سے اُس کی کوئی چیز اپنے اندر کسی نوعیت کی کوئی غرابت نہیں رکھتی، بلکہ ہر پہلو سے صاف اور واضح ہے۔ چنانچہ اُس کے ترجمہ و تفسیر میں ہر جگہ اُس کے الفاظ کے معروف معنی ہی پیشِ نظر رہنے چاہییں۔ اِن سے ہٹ کر اُس کی کوئی تاویل کسی حال میں قبول نہیں کی جاسکتی۔“(21-20)

ہمارے نزدیک روایتی مکاتب میں فکر و نظر کی بیش تر غلط فہمیوں کا باعث عقل و نقل کے اِنھی اصولوں سے گریز ہے۔ چنانچہ قرآن کے قطعی الثبوت اور قطعی الدلالہ نصوص کو ذیلی اور احادیث کے ظنی الثبوت اور ظنی الدلالہ نصوص کو اصل مانا جاتا ہے۔ احادیث کو قرآن کی روشنی میں سمجھنے کے بجاے قرآن کی احادیث کی روشنی میں تاویل کی جاتی ہے۔ یہی معاملہ عربی زبان کے معروف الفاظ و اسالیب کے ساتھ ہے۔ اُنھیں اُن کے مستعمل معانی سے ہٹا کر شاذ اور اجنبی مفاہیم پر محمول کر لیا جاتا ہے۔ علم و فکر کے اِس غلط انداز اور فہم واستدلال کی اِس معکوس ترتیب سے قرآن کے میزان اور فرقان ہونے کی منزلت مجروح ہوتی ہے، زبان و بیان کے مسلمات صرفِ نظر ہوتے ہیں اور بعض اوقات ایسا مدعا سامنے آتا ہے، جو بعض پہلوؤں سے قرآن و حدیث، دونوں کے مطمح نظر کے خلاف ہو۔

البیان

جاوید احمد غامدی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

سورۃ البقرۃ

(16)

كُتِبَ عَلَيْكُمُ الْقِتَالُ وَهُوَ كُرْهٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تَكْرَهُوْا شَيْـًٔا وَّهُوَ خَيْرٌ لَّكُمْ ۚ وَعَسٰٓى اَنْ تُحِبُّوْا
شَيْـًٔا وَّهُوَ شَرٌّ لَّكُمْ ؕ وَاللّٰهُ يَعْلَمُ وَاَنْتُمْ لَا تَعْلَمُوْنَ ﴿٢١٦﴾
يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الشَّهْرِ الْحَرَامِ قِتَالٍ فِيْهِ ؕ قُلْ قِتَالٌ فِيْهِ كَبِيْرٌ ؕ وَصَدٌّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ وَكُفْرٌۢ
بِهٖ وَالْمَسْجِدِ الْحَرَامِ ۗ وَاِخْرَاجُ اَهْلِهٖ مِنْهُ اَكْبَرُ عِنْدَ اللّٰهِ ۚ وَالْفِتْنَةُ اَكْبَرُ مِنَ الْقَتْلِ ؕ وَلَا يَزَالُوْنَ

تم پر جنگ فرض کی گئی اور (اللہ کی راہ میں انفاق کی طرح) وہ بھی تمھیں ناگوار ہے، دراں حالیکہ یہ بالکل ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو ناپسند کرو اور تمھارے لیے وہی بہتر ہو، اور بالکل ممکن ہے کہ تم کسی چیز کو پسند کرو اور وہ تمھارے لیے بری ہو۔ اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ جانتا ہے اور (اِس طرح کی بہت سی چیزوں کو) تم نہیں جانتے۔216

وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ حرام مہینے میں قتال کا کیا حکم ہے؟ کہہ دو کہ اِس میں قتال بڑی ہی سنگین بات ہے، لیکن اللہ کی راہ سے روکنا اور اُس کو نہ ماننا اور بیت الحرام کا راستہ لوگوں پر بند کرنا اور

يُقَاتِلُوْنَكُمْ حَتّٰى يَرُدُّوْكُمْ عَنْ دِيْنِكُمْ اِنِ اسْتَطَاعُوْا ؕ وَ مَنْ يَّرْتَدِدْ مِنْكُمْ عَنْ دِيْنِهٖ فَيَمُتْ وَ هُوَ كَافِرٌ
فَاُولٰٓئِكَ حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ۚ وَ اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ النَّارِ ۚ هُمْ فِيْهَا خٰلِدُوْنَ ﴿۲۱۷﴾ اِنَّ الَّذِيْنَ
اٰمَنُوْا وَ الَّذِيْنَ هَاجَرُوْا وَ جٰهَدُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ ۙ اُولٰٓئِكَ يَرْجُوْنَ رَحْمَتَ اللّٰهِ ؕ وَ اللّٰهُ غَفُوْرٌ رَّحِيْمٌ ﴿۲۱۸﴾
يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْخَمْرِ وَ الْمَيْسِرِ ؕ قُلْ فِيْهِمَاۤ اِثْمٌ كَبِيْرٌ وَّ مَنَافِعُ لِلنَّاسِ ۫ وَ اِثْمُهُمَاۤ اَكْبَرُ مِنْ
نَّفْعِهِمَا ؕ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ مَا ذَا يُنْفِقُوْنَ ؕ۬ قُلِ الْعَفْوَ ؕ كَذٰلِكَ يُبَيِّنُ اللّٰهُ لَكُمُ الْاٰيٰتِ لَعَلَّكُمْ
تَتَفَكَّرُوْنَ ﴿۲۱۹﴾ فِي الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةِ ؕ وَ يَسْـَٔلُوْنَكَ عَنِ الْيَتٰمٰى ؕ قُلْ اِصْلَاحٌ لَّهُمْ خَيْرٌ ؕ وَ اِنْ تُخَالِطُوْهُمْ
فَاِخْوَانُكُمْ ؕ وَ اللّٰهُ يَعْلَمُ الْمُفْسِدَ مِنَ الْمُصْلِحِ ؕ وَ لَوْ شَآءَ اللّٰهُ لَاَعْنَتَكُمْ ؕ اِنَّ اللّٰهَ عَزِيْزٌ حَكِيْمٌ ﴿۲۲۰﴾

اُس کے رہنے والوں کو وہاں سے نکالنا اللہ کے نزدیک اِس سے بھی زیادہ سنگین ہے۔ اور ظلم و جبر کے ذریعے سے لوگوں کو دین سے پھیرنا تو قتل سے بھی بڑا گناہ ہے۔ (تمھیں معلوم ہونا چاہیے کہ جن لوگوں سے قتال کا حکم تمھیں دیا گیا ہے، اُنھوں نے طے کر لیا ہے کہ) وہ تم سے برابر لڑیں گے، یہاں تک کہ اگر اُن کے لیے ممکن ہو تو تمھیں تمھارے دین سے پھیر لے جائیں۔ اور تم میں سے جو کوئی اپنے دین سے پھرے گا اور پھر اِسی کفر کی حالت میں مر جائے گا تو اِسی طرح کے لوگ ہیں جن کے عمل دنیا اور آخرت میں ضائع ہوئے اور یہی دوزخ میں پڑنے والے ہیں، یہ اُس میں ہمیشہ رہیں گے۔ اِس کے برخلاف جو لوگ ایمان پر قائم رہے ہیں اور جنھوں نے ہجرت کی اور اللہ کی راہ میں جہاد کیا ہے، وہی اللہ کی رحمت کے امیدوار ہیں اور اللہ بخشنے والا ہے، اُس کی شفقت ابدی ہے۔ 217-218

وہ تم سے جوے اور شراب کے بارے میں پوچھتے ہیں، (اِس لیے کہ یہ بھی اِن کے ہاں غریبوں کی مدد کا ایک ذریعہ ہیں)۔ کہہ دو کہ اِن دونوں میں گناہ بہت بڑا ہے اور (اِس میں شبہ نہیں کہ) لوگوں کے لیے اِن میں کچھ فائدے بھی ہیں، لیکن اِن کا گناہ اِن کے اِن فائدوں سے کہیں بڑھ کر ہے۔ اور پوچھتے ہیں کہ (اچھا، یہ تو واضح کیجیے کہ) کیا خرچ کریں؟ کہہ دو کہ وہی جو ضرورت سے زیادہ ہے۔ اللہ اِسی طرح تمھارے لیے اپنی آیتوں کی وضاحت کرتا ہے تاکہ تم دنیا اور آخرت، دونوں کے معاملات میں غور کرتے رہو۔ اور وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ (جنگ ہوئی اور لوگ مارے گئے تو اُن کے) یتیموں کے ساتھ کیا معاملہ کیا جائے؟ کہہ دو: جس میں اُن کی بہبود ہو، وہی بہتر ہے۔ اور اگر تم (اُن کی ماؤں سے نکاح کر کے) اُنھیں اپنے ساتھ شامل کر لو تو وہ تمھارے بھائی ہیں، اور اللہ جانتا ہے کہ کون بگاڑنے والا ہے اور کون اصلاح کرنے والا۔ اور اگر اللہ چاہتا تو (اِس کی اجازت نہ دے کر) تمھیں مشقت

وَلَا تَنْكِحُوا الْمُشْرِكٰتِ حَتّٰى يُؤْمِنَّ ؕ وَلَاَمَةٌ مُّؤْمِنَةٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكَةٍ وَّلَوْ اَعْجَبَتْكُمْ ۚ وَلَا
تُنْكِحُوا الْمُشْرِكِيْنَ حَتّٰى يُؤْمِنُوْا ؕ وَلَعَبْدٌ مُّؤْمِنٌ خَيْرٌ مِّنْ مُّشْرِكٍ وَّلَوْ اَعْجَبَكُمْ ؕ اُولٰٓئِكَ يَدْعُوْنَ اِلَى
النَّارِ ۖۚ وَاللّٰهُ يَدْعُوْٓا اِلَى الْجَنَّةِ وَالْمَغْفِرَةِ بِاِذْنِهٖ ۚ وَيُبَيِّنُ اٰيٰتِهٖ لِلنَّاسِ لَعَلَّهُمْ يَتَذَكَّرُوْنَ ﴿٢٢١﴾
وَيَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْمَحِيْضِ ؕ قُلْ هُوَ اَذًى ۙ فَاعْتَزِلُوا النِّسَآءَ فِى الْمَحِيْضِ ۙ وَلَا تَقْرَبُوْهُنَّ حَتّٰى
يَطْهُرْنَ ۚ فَاِذَا تَطَهَّرْنَ فَاْتُوْهُنَّ مِنْ حَيْثُ اَمَرَكُمُ اللّٰهُ ؕ اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ التَّوَّابِيْنَ وَ يُحِبُّ
الْمُتَطَهِّرِيْنَ ﴿٢٢٢﴾ نِسَآؤُكُمْ حَرْثٌ لَّكُمْ ۠ فَاْتُوْا حَرْثَكُمْ اَنّٰى شِئْتُمْ ۫ وَقَدِّمُوْا لِاَنْفُسِكُمْ ؕ وَاتَّقُوا اللّٰهَ
وَاعْلَمُوْٓا اَنَّكُمْ مُّلٰقُوْهُ ؕ وَبَشِّرِ الْمُؤْمِنِيْنَ ﴿٢٢٣﴾

میں ڈال دیتا۔ بے شک، اللہ زبردست ہے، وہ بڑی حکمت والا ہے۔ 220-219

اور (یتیموں کی بہبود کے مقصد سے بھی) مشرک عورتوں سے نکاح نہ کرو، جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ اور (یاد رکھو کہ) ایک مسلمان لونڈی کسی مشرک شریف زادی سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمھیں پسند ہو۔ اور اپنی عورتیں بھی مشرکوں کے نکاح میں نہ دو، جب تک وہ ایمان نہ لے آئیں۔ اور (یاد رکھو کہ) ایک مسلمان غلام کسی مشرک شریف زادے سے بہتر ہے، اگرچہ وہ تمھیں پسند ہو۔ یہ (مشرک لوگ تمھیں) دوزخ کی طرف بلاتے ہیں اور اللہ اپنی توفیق سے جنت اور مغفرت کی دعوت دیتا ہے، اور لوگوں کے لیے اپنی آیتوں کی وضاحت کرتا ہے تاکہ وہ یاددہانی حاصل کریں۔ 221

اور (نکاح کا ذکر ہوا ہے تو) وہ تم سے پوچھتے ہیں کہ (عورتوں کے) حیض کا کیا حکم ہے؟ کہہ دو: یہ ایک طرح کی نجاست ہے۔ چنانچہ حیض کی حالت میں عورتوں سے الگ رہو اور جب تک وہ خون سے پاک نہ ہو جائیں، اُن کے قریب نہ جاؤ۔ پھر جب وہ نہا کر پاکیزگی حاصل کر لیں تو اُن سے ملاقات کرو، جہاں سے اللہ نے تمھیں (اُس کا) حکم دیا ہے۔ یقیناً اللہ اُن لوگوں کو پسند کرتا ہے جو توبہ کرنے والے ہوں اور اُن کو جو پاکیزگی اختیار کرنے والے ہوں۔ تمھاری یہ عورتیں تمھارے لیے کھیتی ہیں، لہٰذا تم اپنی اِس کھیتی میں جس طرح چاہو، آؤ اور (اِس کے ذریعے سے دنیا اور آخرت، دونوں میں) اپنے لیے آگے کی تدبیر کرو اور اللہ سے ڈرتے رہو اور خوب جان لو کہ تمھیں (ایک دن) لازماً اُس سے ملنا ہے۔ اور ایمان والوں کو، (اے پیغمبر، اِس ملاقات کے موقع پر فلاح و سعادت کی) خوش خبری سنا دو۔ 223-222

[باقی]

معارفِ نبوی

اے کہ ترے وجود سے راہِ حیات کا سراغ
اِس شبِ تار میں نہیں تیرے سوا کوئی چراغ

ترجمہ و تحقیق: جاوید احمد غامدی / محمد حسن الیاس

— 1 —

ابو حوراء سعدی کہتے ہیں: میں نے حسن بن علی رضی اللہ عنہ سے پوچھا: آپ کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی کچھ باتیں یاد ہیں؟ انھوں نے فرمایا: ایک مرتبہ آپ مجھے اُس کمرے میں لے گئے، جہاں صدقے کا مال پڑا ہوتا تھا۔ مجھے اتنا یاد ہے کہ میں نے صدقے کی ایک کھجور وہاں سے اٹھا کر اپنے منہ میں ڈال لی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اُس پر لگے ہوئے تھوک سمیت اُسے باہر نکالا اور دوسری کھجوروں میں ڈال دیا۔ ایک شخص نے یہ دیکھا تو کہا: اگر یہ ایک کھجور کھا لیتے تو کیا ہو جاتا؟ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: ہم صدقے کا مال نہیں کھاتے۔ سیدنا حسن کا بیان ہے کہ آپ فرمایا کرتے تھے: اُن چیزوں کو چھوڑ کر جو شک پیدا کرتی ہیں، بے شبہ چیزیں اختیار کیا کرو، اِس لیے کہ سچائی اطمینان اور جھوٹ سراسر تردد اور خلجان ہے۔ (مسند احمد، رقم 1723)

— 2 —

ام کلثوم بنت عقبہ رضی اللہ عنہا کی روایت ہے کہ میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو سنا کہ آپ نے فرمایا: وہ شخص جھوٹا نہیں ہے جو لوگوں کے درمیان صلح کرائے اور اِس کے لیے اچھی بات کہے یا کسی اچھی بات کو بڑھا کر بیان کر دے۔ (ترمذی، رقم 1857)

—3—

عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ سے مروی ہے، وہ کہتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: سچائی کو اختیار کرو، اِس لیے کہ سچائی نیکی کی طرف رہنمائی کرتی ہے، اور نیکی جنت کی طرف لے جاتی ہے۔ (یاد رکھو)، آدمی سچ بولتا ہے، پھر بولتے بولتے اللہ کے نزدیک 'صدیق' لکھ دیا جاتا ہے۔ اور جھوٹ سے بچو، اِس لیے کہ جھوٹ گناہ کی طرف رہنمائی کرتا ہے اور گناہ دوزخ میں لے جاتا ہے۔ (یاد رکھو)، آدمی جھوٹ بولتا ہے، پھر بولتے بولتے اللہ کے نزدیک 'کذاب' لکھ دیا جاتا ہے۔ (مسلم، رقم 4727)

مقامات

جاوید احمد غامدی

نیا فتنہ

مغرب میں قافلۂ سیاست و معیشت نے اپنے سفر کی ابتدا دریاؤں کے کنارے آباد نئے تجارتی شہروں سے کی تھی۔ یہ شہر اُن دیہات سے زیادہ دور نہیں تھے، جہاں ازمنۂ وسطیٰ کے جاگیر دار داد عیش دیتے اور ارباب کلیسا کی پناہ گاہوں کے کلس فلک الافلاک کی خبر لاتے تھے۔ یہ سترھویں صدی کا آغاز تھا اور اب بیسویں صدی اپنے ربع آخر میں ہے۔ اِس سفر میں بعض بڑے سخت مقام آئے ہیں۔ روح اہر من نے نئے قالب تلاش کرنے کے لیے بڑی جدوجہد کی ہے۔ قرون مظلمہ کے قبا پوش جاگیر دار اب دور حاضر کے سگار بدست تاجر اور صنعت کار ہیں۔ سرمایہ کے خلاف محنت کی جدوجہد تاریخ کے عجائب گھر میں عبرت کا مجسمہ بن چکی ہے۔ یہ کارواں اِس صدی کی ابتدا میں جس منزل تک پہنچا تھا، وہاں آدم کا بیٹا دو نیم ہو گیا ہے۔ اُس کا دماغ کریملن کے حفاظت خانوں میں محفوظ کر دیا گیا ہے اور اُس کا جسم ریاست کے لنگر خانوں میں ارتقا کے منازل طے کر رہا ہے۔ دوسری طرف یورپ کے تجارتی شہر وجود بشر کے دل و دماغ بن گئے ہیں۔ زمانۂ قدیم کے دیہات کی دولت بادشاہ کو وجود میں لاتی تھی، اور بادشاہ دہ خداؤں کی پشت پناہی کرتا تھا۔ نئے

شہروں کا سرمایہ پارلیمان کو جنم دیتا ہے اور پارلیمان اُس کی حفاظت کرتی ہے۔ ارتکاز دولت کی کرشمہ سازیاں جسد انسانیت میں بدروح کی طرح حلول کر گئی ہیں۔ کریملن کی سنگین دیواروں اور نیویارک کی فلک بوس عمارتوں پر اِسی آسیب کا قبضہ ہے۔ فرق صرف یہ ہے کہ وہاں اِس نے اپنی حکمرانی کا اعلان کر دیا اور یہاں کے حکمرانوں کی زبان پر اِس کا حکم جاری ہے۔ پوپ اطالیہ کے گوشۂ عافیت میں آرام کر رہا ہے۔ اُس کے محل کا کلس اب بھی فلک آشنا ہے، لیکن مغرب جدید کے بلاد عالیہ میں:

گرجوں سے کہیں بڑھ کے ہیں بنکوں کی عمارات

مشرق ایک طویل عرصے تک اِس سیلاب کی گذر گاہ رہا ہے۔ ہمالہ کی چوٹی پر کھڑے ہو کر دیکھا جائے تو مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک اُس کی تباہ کاریوں کے آثار نمایاں ہیں۔ پانی اتر چکا ہے، لیکن اپنے پیچھے نشیب و فراز چھوڑ گیا ہے۔ مورخ کا قلم اِس کی داستان سفر رقم کرے گا تو عبرت و حیرت کا ایک جہان وجود میں آئے گا۔ تین صدیوں کے ہمہ گیر غلبہ و استیلا کے بعد یہ عفریت اپنے گھر لوٹ آیا ہے، لیکن اِس کے پہلو سے ایک نیا فتنہ جنم لے چکا ہے۔ ہمالہ کی دیوار کو یاجوج وماجوج چاٹ رہے ہیں، اور خدا کے بندے ایک مرتبہ پھر تاریخ کے محشر میں کھڑے ہیں۔

[1979ء]

وہ دیں، عقل و فطرت پہ جس کی اساس　　وہ دیں، روح جس کی خدا کا سپاس
اٹھیں، اِس کو ہر سو ہویدا کریں
زمانے کو پھر اِس کا شیدا کریں

سید منظور الحسن

شق القمر

غامدی صاحب کا موقف

[محمد حسن الیاس کے ساتھ ایک مکالمے سے لیا گیا]

(17)

روایتوں کا تقابلی جائزہ

درجِ بالا تمام روایتیں قرآنِ مجید کے بیان کی فی الجملہ تائید اور تفصیل کرتی ہیں۔ اِن میں سے کوئی بھی کتاب اللہ کے اصل بیان اور مدعا سے متصادم یا متجاوز نہیں ہے۔ اِن کے متفق علیہ نکات کا خلاصہ یہ ہے:

* شق قمر کا واقعہ ایک حسی واقعہ تھا۔
* یہ واقعہ ہجرتِ مدینہ سے کم و بیش پانچ سال پہلے پیش آیا۔
* اِس کے عینی شاہدین میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم، آپ کے صحابۂ کرام اور کفارِ قریش شامل تھے۔

* لوگوں نے بلا امتیازِ مذہب اِسے نسلاً بعد نسلٍ آگے بیان کیا، اِس لیے تاریخی اعتبار سے اِس کی حیثیت خبرِ متواتر کی ہے۔

* واقعہ رات کے ابتدائی مرحلے میں اُس وقت پیش آیا، جب لوگ ابھی جاگ رہے تھے۔

* رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ کے اصحاب منیٰ میں موجود تھے۔

* چاند بدرِ کامل کی صورت میں تھا اور واضح نظر آ رہا تھا۔

* چاند پھٹا اور دو ٹکڑے ہو کر الگ ہو گیا۔

* پھر ایک ٹکڑا پہاڑ کے ایک طرف چلا گیا اور دوسرا دوسری طرف چلا گیا۔

* اِس موقع پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: لوگو، تم گواہ رہنا۔

* کفار نے اِس واقعے کا براہِ راست مشاہدہ کیا، مگر اُنھیں اپنی آنکھوں پر یقین نہ آیا، اِس لیے اُنھوں نے اِسے جادو سے تعبیر کیا۔

* اُنھی میں سے بعض لوگوں نے کہا کہ سفر سے آنے والے لوگوں کا انتظار کرو، کیونکہ اُن پر جادو نہیں ہو سکتا۔

* جب لوگ آئے تو اُنھوں نے بھی اِس واقعے کی شہادت دی۔

* چنانچہ کفار کو اِس واقعے کی حقیقت تسلیم کرنا پڑی۔

* اِس کے باوجود وہ ایمان نہیں لائے۔

شق قمر کی کم و بیش تمام روایتوں میں فی الجملہ یہی نکات مذکور ہیں۔ تاہم، حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت کے بعض طرق میں اِن کے علاوہ چند مزید باتیں بھی نقل ہوئی ہیں۔ دیگر اصحاب کی روایتوں میں یہ منقول نہیں ہیں۔ یہ طرق درجِ ذیل ہیں:

حدثنی عبد اللہ بن عبد الوهاب، حدثنا بشر بن المفضل، حدثنا سعيد بن ابی عروبة، عن قتادة، عن انس بن مالك رضی اللہ عنه: ان اهل مكة سالوا رسول اللہ صلی اللہ عليه وسلم ان يريهم آيةً،	”مجھ سے عبد اللہ بن عبد الوہاب نے بیان کیا، اُنھوں نے کہا کہ ہم سے بشر بن مفضل نے بیان کیا، اُنھوں نے کہا کہ ہم سے سعید بن ابی عروبہ نے بیان کیا، اُن سے قتادہ نے بیان کیا کہ انس بن مالک رضی اللہ عنہ نے بیان کیا کہ

فاراھم القمر شقتین حتی راوا حراءً بینھما. (بخاری، رقم 3868)

کفارِ مکہ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کسی نشانی کا مطالبہ کیا تو نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے چاند کے دو ٹکڑے کر کے دکھا دیے۔ یہاں تک کہ اُنھوں نے حرا پہاڑ کو اُن دونوں ٹکڑوں کے بیچ میں دیکھا۔“

حدثنی زھیر بن حرب، وعبد بن حمید، قالا: حدثنا یونس بن محمد، حدثنا شیبان، حدثنا قتادۃ، عن انس ان اھل مکۃ سالوا رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم ان یریھم آیۃً فاراھم انشقاق القمر مرتین. (مسلم، رقم 7254)

”مجھ سے زہیر بن حرب اور عبد بن حمید نے بیان کیا، اُنھوں نے کہا کہ ہم سے یونس بن محمد نے بیان کیا، اُنھوں نے کہا کہ ہم سے شیبان نے بیان کیا، اُنھوں نے کہا کہ ہم سے قتادہ نے بیان کیا کہ سیدنا انس رضی اللہ عنہ سے روایت ہے کہ مکہ والوں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کوئی نشانی چاہی، آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُن کو دو بار چاند کا پھٹنا دکھایا۔“

اِن طرق میں درجِ ذیل تین اضافی باتیں نقل ہوئی ہیں:

1۔ شق قمر کا واقعہ دو مرتبہ پیش آیا۔

2۔ یہ کفار کے مطالبۂ نشانی کے جواب میں واقع ہوا۔

3۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اُنھیں چاند کا دو ٹکڑے ہونا دکھا دیا۔

یہ تینوں نکات امکانِ وقوع کے لحاظ سے بعید از قیاس نہیں ہیں۔ اِس کی وجہ یہ ہے کہ اللہ کی قدرت سے چاند ایک بار شق ہو سکتا ہے تو ایک سے زیادہ مرتبہ بھی ہو سکتا ہے۔ اِسی طرح اللہ اگر اقوام سابق کے مطالباتِ نشانی کے جواب میں کوئی نشانی بھیج سکتا ہے تو یہ معاملہ قریش کے ساتھ بھی ممکن ہے۔ مزید بر آں، یہ کہ اگر اللہ اپنے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کو متعدد دیگر معجزے عطا

فرما سکتا ہے تو شق قمر کو بھی آپ کے ذریعے سے ظاہر کرنا خلافِ توقع نہیں ہے۔ تاہم، اِس کے باوجود بیش تر محدثین اور مفسرین نے اِن اضافوں کو قبول نہیں کیا۔

اِس ضمن میں اُن کے دلائل کا خلاصہ یہ ہے:

1۔ اِس واقعے کے وقوع کے موقع پر حضرت انس رضی اللہ عنہ چار پانچ سال کے کم سن تھے اور مدینہ میں رہتے تھے۔ اِس سے واضح ہے کہ اُنھوں نے اِس واقعے کا براہِ راست مشاہدہ نہیں کیا۔ مزید یہ کہ جن شخصیات سے اُنھوں نے واقعے کو سنا، اُن کا ذکر روایت میں نہیں ہے۔ اِس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ اُنھوں نے اِسے اپنے زمانے کی ایک مشہور و معروف خبر کے طور پر سنا اور نقل کیا ہے۔ اِس بنا پر ضروری ہے کہ اِس معاملے میں اصل خبر کی حیثیت واقعے کے عینی شاہد حضرت عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ کی روایت کو دی جائے اور حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایتوں کے فقط اُنھی اجزا کو قبول کیا جائے، جو ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ اور دیگر عینی شاہدین کی روایات سے مطابقت رکھتے ہیں۔

2۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں 'مرتین' کے الفاظ آئے ہیں، جن کا مطلب یہ ہے کہ یہ واقعہ دو مرتبہ پیش آیا ہے۔ یہ ایک بالکل منفرد بات ہے۔ قرآنِ مجید کے الفاظ بھی اِس مفہوم کی گنجایش نہیں دیتے۔ وہ انشقاق القمر کے واحد وقوع پر دلالت کرتے ہیں۔ قرین قیاس یہی ہے کہ بعد کے بعض راویوں نے غلط فہمی سے 'فرقتین' یا 'فلقتین' (دو ٹکڑے) کو 'مرتین' (دو بار) سمجھ کر نقل کر دیا ہے۔ یہ غلطی مذکورہ روایت کے ضعف کی طرف اشارہ کرتی ہے۔

3۔ حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی بعض طرق میں کفار کی طرف سے نشانی کے مطالبے کا ذکر نہیں ہے اور بعض طرق میں 'مرتین' کے بجائے درست لفظ 'فرقتین' استعمال ہوا ہے۔ یہ بات بھی اِس امر کا امکان پیدا کرتی ہے کہ اِس طرح کے الفاظ بعد کے راویوں کے اضافے ہیں۔

ان دلائل کے حوالے سے حدیث و تفسیر کے چند علما کے اقتباسات درجِ ذیل ہیں:

"المواہب اللدنیہ" میں علامہ احمد بن محمد قسطلانی لکھتے ہیں:

فأما أنس وابن عباس فلم يحضرا ذلك، لانه كان بمكة قبل الهجرة

"جہاں تک حضرت انس رضی اللہ عنہ اور حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ

بنحو خمس سنين، وكان ابن عباس إذ ذاك لم يولد، وأما أنس فكان ابن أربع سنين أو خمس بالمدينة. (254/2)

کا تعلق ہے تو وہ اِس واقعہ کے وقت موجود نہ تھے، کیونکہ یہ واقعہ مکہ مکرمہ میں ہجرت سے تقریباً پانچ سال پہلے ہوا اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ ابھی پیدا بھی نہیں ہوئے تھے۔ اور حضرت انس رضی اللہ عنہ اُس وقت چار پانچ سال کے تھے اور مدینہ طیبہ میں تھے۔“

امام ابنِ حجر عسقلانی نے ”فتح الباری“ میں لکھا ہے:

لان أنسًا لم يدرك هذه القصة وقد جاءت هذه القصة من حديث بن عباس وهو أيضًا ممن لم يشاهدها ومن حديث بن مسعود وجبير بن مطعم وحذيفة وهؤلاء شاهدوها ولم ار في شيء من طرقه ان ذلك كان عقب سؤال المشركين الا في حديث أنس ثم وجدت في بعض طرق حديث بن عباس.(182/7)

”حضرت انس رضی اللہ عنہ نے اِس واقعے کا مشاہدہ نہیں کیا، اور حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ جن سے یہ واقعہ منقول ہے، اُنھوں نے بھی اِس کا مشاہدہ نہیں کیا۔ حضرت عبداللہ بن مسعود، حضرت جبیر بن مطعم اور حضرت حذیفہ بن یمان رضی اللہ عنہم جو اِس واقعے کے عینی شاہد ہیں، اُن کی روایتوں میں اِس طرح کی بات نہیں ہے کہ یہ واقعہ مشرکین کے مطالبے کے جواب میں تھا۔ یہ بات صرف حضرت انس رضی اللہ عنہ کی روایت میں مذکور ہے یا حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کے بعض طرق میں نقل ہوئی ہے۔“

وہ مزید لکھتے ہیں:

ولا اعرف من جزم من علماء الحديث بتعدد الانشقاق فی زمنه صلی اللّٰہ علیہ وسلم، . . . وهذا مما يعلم أهل الحديث والسير انه غلط فإنه لم يقع الا مرةً واحدةً. (183/7)

”میں نہیں جانتا کہ علماے حدیث میں سے کوئی اِس کا قائل ہوا ہو کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانے میں چاند کے شق ہونے کا واقعہ متعدد بار ہوا... اور اہل حدیث اور اہل سیر کے نزدیک یہ بات غلط ہے۔ پس حقیقت یہ ہے کہ شق قمر کا واقعہ فقط ایک مرتبہ ہوا ہے۔“

حافظ ابنِ حجر کی اِسی بات کا خلاصہ کرتے ہوئے علامہ قسطلانی نے لکھا ہے:

ولعل قائل ’مرتين‘ أرادا: فرقتين. وهذا الذی لا يتجه غيره جمعًا بين الروايات. (المواہب اللدنیہ 256/2)

”اور ممکن ہے کہ ’مرتین‘ کہنے والوں کا مطلب ’فرقتین‘ ہو۔ مختلف روایات کو صرف اِسی طرح جمع کیا جاسکتا ہے۔“

مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے اِن نکات کو بالتفصیل بیان کیا ہے۔ ”تفہیم القرآن“ میں ہے:

”بعض روایات جو حضرت انس رضی اللہ عنہ سے مروی ہیں، اُن کی بنا پر یہ غلط فہمی پیدا ہوتی ہے کہ شق القمر کا واقعہ ایک مرتبہ نہیں، بلکہ دو مرتبہ پیش آیا تھا۔ لیکن اول تو صحابہ میں سے کسی اور نے یہ بات بیان نہیں کی ہے۔ دوسرے خود حضرت انس کی بھی بعض روایات میں مرتین (دو مرتبہ) کے الفاظ ہیں اور بعض میں ’فرقتین‘ اور ’شقتین‘ (دو ٹکڑے) کے الفاظ۔ تیسرے یہ کہ قرآنِ مجید صرف ایک ہی انشقاق کا ذکر کرتا ہے۔ اِس بنا پر صحیح بات یہی ہے کہ یہ واقعہ صرف ایک مرتبہ پیش آیا تھا۔ رہے وہ قصے جو عوام میں مشہور ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے انگلی سے چاند کی طرف اشارہ کیا اور وہ دو ٹکڑے ہو گیا اور یہ کہ چاند کا ایک ٹکڑا حضور کے گریبان میں داخل ہو کر آپ کی آستین سے نکل گیا، تو یہ بالکل ہی بے اصل ہیں۔

یہاں یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ اِس واقعہ کی حقیقی نوعیت کیا تھی؟ کیا یہ ایک معجزہ تھا، جو کفارِ مکہ کے مطالبہ پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنی رسالت کے ثبوت میں دکھایا تھا؟ یا یہ ایک

حادثہ تھا، جو اللہ تعالیٰ کی قدرت سے چاند میں پیش آیا اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے لوگوں کو اِس کی طرف توجہ صرف اِس غرض کے لیے دلائی کہ یہ امکانِ قیامت اور قربِ قیامت کی ایک نشانی ہے؟ علماے اسلام کا ایک بڑا گروہ اِسے حضور کے معجزات میں شمار کرتا ہے اور اُن کا خیال یہ ہے کہ کفار کے مطالبہ پر یہ معجزہ دکھایا گیا تھا۔ لیکن اِس راے کا مدار صرف بعض اُن روایات پر ہے، جو حضرت انس سے مروی ہیں۔ اُن کے سوا کسی صحابی نے بھی یہ بات بیان نہیں کی ہے۔ فتح الباری میں ابنِ حجر کہتے ہیں کہ ”یہ قصہ جتنے طریقوں سے منقول ہوا ہے، اُن میں سے کسی میں بھی حضرت انس کی حدیث کے سوا یہ مضمون میری نگاہ سے نہیں گزرا کہ شق القمر کا واقعہ مشرکین کے مطالبہ پر ہوا تھا۔“ (باب انشقاق القمر)۔ ایک روایت ابو نعیم اصفہانی نے دلائل النبوۃ میں حضرت عبد اللہ بن عباس سے بھی اِس مضمون کی نقل کی ہے، مگر اُس کی سند ضعیف ہے، اور قوی سندوں سے جتنی روایات کتبِ حدیث میں ابنِ عباس سے منقول ہوئی ہیں، اُن میں سے کسی میں بھی اِس کا ذکر نہیں ہے۔ علاوہ بریں حضرت انس اور حضرت عبد اللہ بن عباس، دونوں اِس واقعہ کے ہم عصر نہیں ہیں۔ بخلاف اِس کے جو صحابہ اُس زمانے میں موجود تھے، حضرت عبد اللہ بن مسعود، حضرت حذیفہ، حضرت جبیر بن مطعم، حضرت علی، حضرت عبد اللہ بن عمر، اُن میں سے کسی نے بھی یہ نہیں کہا ہے کہ مشرکین مکہ نے حضور کی صداقت کے ثبوت میں کسی نشانی کا مطالبہ کیا تھا اور اِس پر شق القمر کا یہ معجزہ اُن کو دکھایا گیا۔ سب سے بڑی بات یہ ہے کہ قرآنِ مجید خود بھی اِس واقعہ کو رسالت محمدی کی نہیں، بلکہ قربِ قیامت کی نشانی کے طور پر پیش کر رہا ہے۔ البتہ، یہ اِس لحاظ سے حضور کی صداقت کا ایک نمایاں ثبوت ضرور تھا کہ آپ نے قیامت کے آنے کی جو خبریں لوگوں کو دی تھیں، یہ واقعہ اُن کی تصدیق کر رہا تھا۔“ (5/ 230-229)

[باقی]

تفہیم الآثار

ڈاکٹر عمار خان ناصر

صحابۂ کرام رضی اللہ عنہم کا علم و عمل بہ طور اسوہ

(اکابر تابعین کے آثار)

(3)

(6)

عَنْ طَارِقِ بْنِ عَبْدِ الرَّحْمَنِ، قَالَ: انْطَلَقْتُ حَاجًّا فَمَرَرْتُ بِقَوْمٍ يُصَلُّونَ قُلْتُ: مَا هَذَا الْمَسْجِدُ؟ قَالُوا: هَذِهِ الشَّجَرَةُ حَيْثُ بَايَعَ رَسُولُ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ بَيْعَةَ الرِّضْوَانِ، فَأَتَيْتُ سَعِيدَ بْنَ الْمُسَيِّبِ فَأَخْبَرْتُهُ، فَقَالَ سَعِيدٌ: حَدَّثَنِي أَبِي أَنَّهُ كَانَ فِيمَنْ بَايَعَ رَسُولَ اللّٰهِ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ تَحْتَ الشَّجَرَةِ، قَالَ: فَلَمَّا خَرَجْنَا مِنَ الْعَامِ الْمُقْبِلِ نَسِينَاهَا فَلَمْ نَقْدِرْ عَلَيْهَا، فَقَالَ سَعِيدٌ: إِنَّ أَصْحَابَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللّٰهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ لَمْ يَعْلَمُوهَا وَعَلِمْتُمُوهَا أَنْتُمْ، فَأَنْتُمْ أَعْلَمُ. (بخاری، رقم 4163)

”طارق بن عبد الرحمٰن کہتے ہیں کہ میں حج کے لیے گیا تو راستے میں کچھ لوگوں کے پاس سے گزر ہوا جو ایک جگہ پر نماز ادا کر رہے تھے۔ میں نے پوچھا کہ یہ نماز ادا کرنے کی کون سی جگہ ہے؟ انھوں نے کہا کہ یہ وہ درخت ہے جہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ سے بیعت

رضوان لی تھی۔ (طارق کہتے ہیں): میں سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ کے پاس گیا اور انھیں یہ بات بتائی۔ انھوں نے کہا کہ مجھے میرے والد (مسیب بن حزن رضی اللہ عنہ) نے بتایا کہ وہ ان صحابہ میں شامل تھے جنھوں نے درخت کے نیچے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بیعت کی تھی۔ میرے والد نے کہا کہ جب ہم اگلے سال (عمرہ قضا کرنے کے لیے) گئے تو اس درخت کو بھول چکے تھے اور اس کو تلاش نہیں کر سکے۔ (یہ روایت بیان کر کے) سعید بن المسیب نے کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ کو تو وہ درخت معلوم نہیں ہو سکا اور تم لوگوں کو معلوم ہو گیا ہے تو پھر تو تم ان سے زیادہ علم رکھنے والے ہوئے۔"

صاحب اثر کا تعارف

سعید بن المسیب رحمہ اللہ کا شمار فقہاے سبعہ، یعنی دور تابعین میں حجاز کے سات بڑے فقہا میں ہوتا ہے۔ انھیں سید التابعین کا لقب بھی دیا جاتا ہے۔ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کی خلافت کے دوسرے یا چوتھے سال میں مدینہ میں ولادت ہوئی اور 93ھ یا 94ھ میں یہیں وفات پائی۔ معروف صحابی، مسیب بن حزن رضی اللہ عنہ کے بیٹے اور سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کے داماد تھے اور اسی تعلق سے انھیں سیدنا ابوہریرہ رضی اللہ عنہ کی مرویات کا سب سے بڑا عالم مانا جاتا تھا۔ انھیں اکابر صحابہ میں سے سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو دیکھنے کا اور سیدنا عثمان، علی، زید بن ثابت، ابو موسیٰ اشعری، سعد بن ابی وقاص، سیدہ عائشہ، ابوہریرہ، عبد اللہ بن عباس، محمد بن سلمہ اور سیدہ ام سلمہ رضی اللہ عنہم سے روایات سننے کا شرف حاصل ہوا۔ (ذہبی، سیر اعلام النبلاء 5/ 125-124)

شرح ووضاحت

1۔ سنہ 6 ہجری میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم صحابہ کے ہم راہ عمرے کے لیے مکہ مکرمہ کی طرف روانہ ہوئے تو مشرکین کی مزاحمت کی وجہ سے آپ کو حدیبیہ کے مقام پر رکنا پڑا۔ اسی موقع پر آپ نے ایک درخت کے نیچے پوری جماعت سے، جن کی تعداد چودہ سو بیان کی جاتی ہے، اس بات پر بیعت لی کہ اگر قتال کی نوبت آئی تو وہ ثابت قدم رہیں گے۔ اس بیعت کا ذکر قرآن مجید میں سورۂ الفتح (آیت 18) میں کیا گیا اور اصحاب بیعت کو اللہ کی طرف سے رضا کا پروانہ دیا گیا ہے۔

اسی مناسبت سے اسے 'بیعۃ الرضوان' اور اس کے شرکا کو 'اصحاب الشجرۃ' کہا جاتا ہے۔

شجرۂ بیعت کی تاریخی اہمیت کی وجہ سے آیندہ سال صحابہ نے اس درخت کو تلاش کرنے کی کوشش کی، تاہم مسیب رضی اللہ عنہ کے بیان کے مطابق اس میں انھیں کامیابی نہیں ہوئی۔ دیگر آثار سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ صحابہ کو یا تو متعین طور پر یہ درخت معلوم نہیں تھا اور اگر معلوم تھا تو بھی انھوں نے لوگوں کے لیے اس کی نشان دہی سے گریز کیا۔ چنانچہ جابر بن عبد اللہ رضی اللہ عنہ سے منقول ہے کہ آخری عمر میں جب ان کی بینائی چلی گئی تھی، انھوں نے لوگوں سے کہا کہ 'ولو کُنتُ أُبصِرُ الیومَ لأرَیتُکم مَکانَ الشَّجَرَۃِ' (بخاری، رقم 4154)، یعنی اگر آج میری بینائی ہوتی تو میں تمھیں وہ درخت دکھا سکتا تھا۔ ظاہر ہے، اگر وہ اس کی کوئی خاص اہمیت سمجھتے تو بینائی جانے سے پہلے درخت کی نشان دہی کر سکتے تھے۔

عبد اللہ ابن عمر رضی اللہ عنہ کا بیان ہے کہ اگلے سال ہم نے اس درخت کو تلاش کرنے کی کوشش کی تو ہم میں سے دو آدمی بھی کسی ایک درخت پر متفق نہیں ہو سکے اور یہ اللہ کی طرف سے ایک رحمت تھی: 'رَجَعْنَا مِنَ العَامِ المُقْبِلِ، فَما اجْتَمَعَ مِنَّا اثْنَانِ علَى الشَّجَرَۃِ الَّتی بَایَعْنَا تَحْتَهَا، کَانَتْ رَحْمَۃً مِنَ اللّٰہِ' (بخاری، رقم 2985)۔ ابن عمر رضی اللہ عنہ کے درخت کی تعیین نہ ہو پانے کو اللہ کی رحمت قرار دینا اس پہلو سے تھا کہ اگر وہ درخت معلوم ہو جاتا تو لوگوں کی توجہ اور اہتمام کا مرکز بن جاتا اور اس کے پاس جانا رفتہ رفتہ ایک دینی رسم کی حیثیت اختیار کر لیتا، جب کہ شارع کی طرف اس کی یہ حیثیت مقرر نہیں کی گئی۔

بعض روایات میں بیان ہوا ہے کہ سیدنا عمر رضی اللہ عنہ کو جب معلوم ہوا کہ لوگ اس درخت کے پاس جانے کا اہتمام کرنے لگے ہیں تو انھوں نے حکم دیا کہ اس کو کاٹ دیا جائے۔ (مصنف ابن ابی شیبہ، رقم 7433) علامہ البانی نے اس کی سند میں انقطاع کی نشان دہی کے علاوہ یہ سوال اٹھایا ہے کہ جب یہ درخت متعین طور پر معلوم ہی نہیں تھا تو سیدنا عمر اس کو کٹوا کیسے سکتے تھے۔ (تحذیر المساجد 126) تاہم غور کرنے سے واضح ہوتا ہے کہ درخت کو کٹوانے کے لیے یہ ضروری نہیں تھا کہ یہ وہی درخت ہو جس کے نیچے بیعت لی گئی تھی۔ یہ قرین قیاس ہے کہ جب لوگوں نے ظن و تخمین سے کسی درخت کو متعین کر کے اس کے پاس جانے کا اہتمام شروع کر دیا تو سیدنا عمر نے سد ذریعہ کے طور پر اس کو بھی کٹوا دیا ہو گا۔

2۔ اس تناظر میں جب بعد کے دور میں کسی وقت لوگوں نے اپنے طور پر اس درخت کی تعیین کی کوشش کی تو سعید بن المسیب نے اپنے والد کے مذکورہ قول کا حوالہ دیا اور لوگوں پر واضح کیا کہ اگر اس خاص درخت کی نشان دہی اور تعیین کو محفوظ رکھنا دینی لحاظ سے کوئی ایسا اہم معاملہ ہوتا تو اس کا علم سب سے بڑھ کر صحابہ کو ہونا چاہیے تھا۔ جب اگلے سال جستجو کے باوجود وہ اس درخت کو متعین نہیں کر سکے اور انھوں نے اس کا خاص اہتمام بھی نہیں کیا تو بعد والوں کے لیے اس کو یقینی طور پر متعین کرنے کا امکان اس سے کہیں کم ہے اور اس کو اتنی اہمیت دینے کی بھی ضرورت نہیں۔ آخری جملے میں سعید بن المسیب رضی اللہ عنہ نے جہاں لوگوں کی تعیین کے، قیاس و تخمین پر مبنی ہونے پر تبصرہ کیا ہے، وہاں اس میں اس نوعیت کی ایک تعریض بھی مضمر ہے، جیسی عبد اللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ نے کوفہ کی مسجد میں اجتماعی ذکر کے لیے جمع ہونے والوں پر کی تھی۔ ابن مسعود نے ان سے کہا کہ:

وَاللّٰهِ لَقَدْ جِئْتُمْ بِبِدْعَةٍ ظَلْمَاءَ، أَوْ قَدْ فَضَلْتُمْ أَصْحَابَ مُحَمَّدٍ صَلَّى اللَّهُ عَلَيْهِ وَسَلَّمَ عِلْمًا. (طبرانی، المعجم الکبیر، رقم 8509، 8511)

”بخدا یا تو تم نے ایک بہت تاریک بدعت نکال لی ہے اور یا پھر تم علم میں محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے صحابہ پر فضیلت رکھتے ہو۔“

تخریج اور اختلاف طرق

یہ اثر الفاظ کے کسی خاص فرق کے بغیر درج ذیل مصادر میں بھی منقول ہے:

صحیح مسلم، رقم 1859۔ المعجم الکبیر للطبرانی، رقم 17603۔ الطبقات الکبیر لابن سعد، رقم 1545۔

(7)

عن مبارك بن فضالة، عن الحسن قال: إِنَّ أَصْحَابَ مُحَمَّدٍ صلى الله عليه وسلم كَانُوا أَكْيَاسًا: عَمِلُوا صَالِحًا، وَأَكَلُوا طَيِّبًا، وَقَدَّمُوا فَضْلًا، لَمْ يُنَافِسُوا أَهْلَ الدُّنْيَا فِي دُنْيَاهُمْ، وَلَمْ يُنَافِسُوهُمْ فِي عِزِّهَا، وَلَمْ يَجْزَعُوا لِذُلِّهَا، أَخَذُوا صَفْوَهَا، وَتَرَكُوا كَدَرَهَا،

وَاللّٰهِ مَا تَعَاظَمُ فِي أَنْفُسِهِمْ حَسَنَةٌ عَمِلُوهَا، وَلَا تَصْغُرُ فِي أَنْفُسِهِمْ سَيِّئَةٌ [أَمَرَهُمُ الشَّيْطَانُ بِهَا]. (ابن ابی الدنیا، الزہد، رقم 233)

”مبارک بن فضالہ روایت کرتے ہیں کہ حسن بصری نے کہا: محمد صلی اللہ علیہ وسلم کے اصحاب بہت سمجھ دار اور دانا لوگ تھے۔ انھوں نے اچھے عمل کیے، پاکیزہ رزق کھایا، ضرورت سے زائد مال (صدقہ کر کے) آگے بھیج دیا، دنیا والوں کے ساتھ نہ دنیا کے حصول میں مقابلہ کیا، نہ دنیا کی عزت پانے کے لیے مسابقت کی اور نہ دنیا کی ذلت پر بے صبری کا شکار ہوئے۔ دنیا میں جو کچھ صاف تھا، وہ لے لیا اور جو گدلا تھا، اسے چھوڑ دیا۔ بخدا، ان کے دل میں اپنی کی ہوئی نیکی کی بڑائی کا احساس نہیں تھا اور شیطان نے انھیں جو برائی کرنے پر آمادہ کیا، وہ اپنے دل میں اسے معمولی نہیں جانتے تھے۔“

لغوی تشریح

أَكْيَاسٌ: ’كَيِّسٌ‘ کی جمع ہے، یعنی دانا اور سمجھ دار۔

قَدَّمُوا فَضْلًا: ’قَدَّمَ‘ کا لفظی مطلب ہے، کوئی چیز آگے بھیجنا یا کسی معاملے کے لیے پیشگی بندوبست کرنا۔ ’فَضْل‘، یعنی ضرورت سے زائد اسباب۔

وَلَمْ يَجْزَعُوا لِذُلِّهَا: ’جزع‘ کا مطلب ہے، بے صبری اور گھبراہٹ میں مبتلا ہونا اور شکوہ و شکایت میں لگ جانا۔ مراد یہ کہ انھیں دنیا میں آزمایش کے تحت اگر ذلت یا استخفاف سے دوچار ہونا پڑا تو اس پر بے صبری کا شکار ہو کر شکوہ و شکایت نہیں کی۔

صاحب اثر کا تعارف

ابو سعید حسن بن یسار بصری رحمہ اللہ جلیل القدر تابعی ہیں اور تفسیر وحدیث کے بلند پایہ عالم ہونے کے علاوہ وعظ و تلقین اور اپنے خطبات کی فصاحت وبلاغت کے حوالے سے بھی خاص شہرت رکھتے ہیں۔ سیدنا عمر کے عہد خلافت میں 21 ہجری میں مدینہ میں ولادت ہوئی۔ ان کی والدہ ام المومنین ام سلمہ رضی اللہ عنہا کی خدمت گزار تھیں اور اس تعلق سے حسن نے بھی

بچپن میں سیدہ کے گھر میں بھی کچھ وقت گزارا۔ سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ کی شہادت کے بعد بصرہ منتقل ہو گئے اور اسی نسبت سے حسن بصری کے نام سے معروف ہوئے۔ مدینہ میں انھیں سیدنا عثمان رضی اللہ عنہ اور سیدنا طلحہ رضی اللہ عنہ کی زیارت کی سعادت حاصل ہوئی اور صحابہ کی ایک بڑی جماعت سے روایت حدیث کا موقع ملا، جس میں عمران بن حصین، مغیرہ بن شعبہ، نعمان بن بشیر، جابر بن عبد اللہ، ابن عباس اور انس بن مالک رضی اللہ عنہم شامل ہیں۔ 110ھ میں بصرہ میں وفات پائی۔ (ذہبی، سیر اعلام النبلاء، 4/ 565-564)

شرح ووضاحت

یہ اثر حسن بصری کے مواعظ میں سے کسی وعظ کا حصہ معلوم ہوتا ہے، جس میں وہ لوگوں کو صحابہ کی سیرت و کردار کا حوالہ دے کر دنیا اور سامان دنیا سے متعلق مطلوب رویے کی تعلیم دینا چاہ رہے ہیں۔ حاصل یہ ہے کہ صحابہ نے آخرت کو مطمح نظر بنایا اور دنیا کی محبت اور حصول دنیا کی مسابقت میں شریک نہیں ہوئے۔ اسی طرح خوف خدا اور جواب دہی کے احساس سے اپنی نیکیوں کے متعلق کسی زعم میں اور اپنے گناہوں کے حوالے سے کسی بے پروائی میں مبتلا نہیں ہوئے۔

اثر کے دوسرے جملے میں ’أَكَلُوا طَيِّبًا وَقَدَّمُوا فَضْلًا‘ کا مفہوم یہ ہے کہ صحابہ دنیا کی طمع میں مبتلا نہیں ہوئے اور جو کچھ مال و اسباب ان کو ملا، اس سے بقدر ضرورت فائدہ اٹھا کر بیش تر حصہ صدقہ و انفاق کی نذر کر دیا۔ صدقہ و انفاق اور دیگر اعمال خیر کے لیے آگے بھیجنے کی تعبیر قرآن و حدیث کی معروف تعبیر ہے: ’وَمَا تُقَدِّمُوا لِاَنفُسِكُم مِّن خَيرٍ تَجِدُوهُ عِندَ اللهِ‘، ”اور تم جو بھی نیکی اپنے لیے آگے بھیجو گے، اس کا اجر اللہ کے ہاں پالو گے۔“ (البقرہ 2:110)

ابن المبارک رحمہ اللہ کی روایت کے مطابق، حسن بصری رحمہ اللہ نے ایک موقع پر دنیوی مال و اسباب سے متعلق صحابہ کے اس طرز عمل کو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کے ایک واقعے کا حوالہ دے کر بیان کیا۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم ایک موقع پر صحابہ کو ساتھ لے کر بقیع الغرقد تشریف لے گئے، جہاں مدینے کا قبرستان تھا۔ آپ نے صحابہ سے کہا کہ میرے جو ساتھی وفات پا چکے ہیں، وہ تم سے بہتر ہیں، کیونکہ وہ اپنی قربانیوں کا صلہ وصول کیے بغیر دنیا سے رخصت ہو گئے، جب کہ تم نے کچھ صلہ دنیا میں بھی وصول کر لیا ہے۔ اس واقعے کو بیان کر کے حسن بصری نے کہا:

فَلَمَّا سَمِعَهَا الْقَوْمُ وَاللّٰهِ عَقَلُوهَا، وَانْتَفَعُوا بِهَا، قَالُوا: وَإِنَّا لَمُحَاسَبُونَ بِمَا أَصَبْنَا مِنَ الدُّنْيَا، وَإِنَّهُ لَيُنْقَصُ بِهِ مِنْ أُجُورِنَا، فَأَكَلُوا وَاللّٰهِ طَيِّبًا وَأَنْفَقُوا قَصْدًا، وَقَدَّمُوا فَضْلًا.

(الزہد والرقائق لابن المبارک، رقم 498)

’’صحابہ نے جب یہ بات سنی تو بخدا اس کو سمجھ لیا اور اس سے نفع پایا۔ انھوں نے کہا کہ دنیا سے ہمیں جو کچھ ملا ہے، اس پر ہمارا محاسبہ ہو گا اور اس کی وجہ سے ہمارے اجر میں کمی ہو جاتی ہے۔ (حسن بصری نے کہا کہ) بخدا، انھوں نے پاکیزہ رزق کھایا، اعتدال سے خرچ کیا اور زائد اموال (آخرت کے لیے) آگے بھیج دیے۔‘‘

مراد یہ کہ صحابہ نے اپنی ضرورتوں کو کم سے کم رکھتے ہوئے صدقہ وانفاق کرکے آخرت کے لیے نیکیاں جمع کرنے کو ترجیح دی۔

تخریج اور اختلاف طرق

یہ اثر الفاظ کے معمولی فرق کے ساتھ بیہقی نے شعب الایمان میں اور ابن ابی الدنیا نے ذم الدنیا میں بھی نقل کیا ہے۔ (شعب الایمان، رقم 10149۔ ذم الدنیا لابن ابی الدنیا، رقم 174)۔ اثر کے آخری جملے میں ’أمرهم الشيطان بها‘ کا ٹکڑا ابن ابی الدنیا کے طریق میں موجود نہیں، یہ بیہقی سے لیا گیا ہے۔

(8)

عَنْ خَلَفِ بْنِ حَوْشَبٍ، عَنِ الْحَسَنِ الْبَصْرِيِّ، قَالَ: كَانَ يَقُولُ: إِنِّي أَدْرَكْتُ صَدْرَ هٰذِهِ الْأُمَّةِ ثُمَّ طَالَ بِي عُمُرٌ حَتّٰى أَدْرَكْتُكُمْ، فَوَالَّذِي لَا إِلٰهَ غَيْرُهُ لَهُمْ كَانُوا أَبْصَرَ فِي دِينِهِمْ بِقُلُوبِهِمْ مِنْكُمْ فِي دُنْيَاكُمْ بِأَبْصَارِكُمْ، وَلَهُمْ كَانُوا فِيمَا أَحَلَّ اللّٰهُ لَهُمْ أَزْهَدَ مِنْكُمْ فِيمَا حَرَّمَ اللّٰهُ عَلَيْكُمْ، وَلَهُمْ كَانُوا مِنْ حَسَنَاتِهِمْ أَلَّا تُقْبَلَ مِنْهُمْ أَشَدَّ شَفَقَةً مِنْكُمْ مِنْ سَيِّئَاتِكُمْ أَنْ تُؤْخَذُوا بِهَا. (الاشراف فی منازل الاشراف لابن ابی الدنیا 331)

”خلف بن حوشب کی روایت ہے کہ حسن بصری کہتے تھے: میں نے اس امت کے پہلے طبقے، (یعنی صحابہ) کا زمانہ پایا ہے۔ پھر میری عمر اتنی لمبی ہوگئی کہ میں نے تمھارے دور کو بھی پا لیا۔ اس ذات کی قسم جس کے سوا کوئی الٰہ نہیں، تم اپنی دنیا پر اپنی آنکھوں سے جتنی نظر رکھتے ہو، صحابہ اپنے دین کے معاملے میں اپنے دلوں میں اس سے زیادہ چوکنا رہتے تھے۔ اور اللہ کی حلال کردہ چیزوں میں ان کی رغبت اس سے بھی کم تھی، جتنی رغبت تمھیں اللہ کی حرام کردہ چیزوں میں محسوس ہوتی ہے۔ اور تم جتنا خوف اپنے گناہوں کے محاسبے کا رکھتے ہو، صحابہ کو اس سے زیادہ خوف اس بات کا ہوتا تھا کہ ان کی نیکیاں قبول نہ کی جائیں۔“

شرح ووضاحت

1۔ اس اثر میں حسن بصری نے بہت موثر انداز میں تقویٰ اور خوف خدا کے باب میں صحابہ کی کیفیت کا موازنہ بعد کے لوگوں کی کیفیت کے ساتھ کرتے ہوئے تین پہلوؤں سے فرق کو واضح کیا ہے:

پہلا یہ کہ صحابہ کی نظر میں حفاظت اور نگرانی کی چیز دین تھی، دنیا نہیں تھی۔ بعد کے لوگ جتنی دیکھ بھال اور نگرانی اپنے دنیوی نفع ونقصان کی کرتے ہیں، صحابہ اس سے کہیں زیادہ اپنے دین کے متعلق فکرمند رہتے تھے کہ کہیں اس میں کوئی رخنہ واقع نہ ہو جائے۔

دوسرا یہ کہ دنیا میں ان کی بے رغبتی اور زہد کی کیفیت یہ تھی کہ اللہ کی حلال کردہ چیزوں میں بھی ان کے لیے اتنی کشش نہیں تھی، جتنی کشش اور رغبت بعد کے لوگوں کو اللہ کی حرام کردہ چیزوں میں محسوس ہوتی ہے۔

تیسرا یہ کہ اللہ کے ہاں جواب دہی اور مواخذہ کے پہلو سے صحابہ کی فکرمندی یہ نہیں ہوتی تھی کہ ان کے گناہوں کا حساب لیا جائے گا، بلکہ یہ ہوتی تھی کہ ہم نے جو نیکیاں کی ہیں، وہ بھی اللہ کی بارگاہ میں قابل قبول ہوں گی یا نہیں۔ مطلب یہ کہ اگر اپنی نیکیوں کے متعلق ان کا احساس یہ تھا تو اس سے اندازہ کیا جا سکتا ہے کہ گناہوں کے مواخذے کے متعلق ان کے دلوں میں خوف خدا کی کیفیت کیا ہو گی۔

2۔ دینی کیفیات کے لحاظ سے صحابہ اور بعد کے طبقات کا یہ فرق حسن بصری نے اپنے

مشاہدے کی روشنی میں محسوس کیا اور بڑی خوبی سے اس اثر میں بیان کر دیا ہے۔ بنیادی طور پر یہ طرز فکر نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت اور تعلیم و تربیت کا نتیجہ تھا۔ آپ کی تعلیم کردہ ایک دعا میں دنیا کے تعلق سے مذکورہ ذہنی رویے کی تعلیم یوں دی گئی ہے:

اَللّٰھُمَّ ...لَا تَجْعَلْ مُصِیبَتَنَا فِی دِینِنَا وَلَا تَجْعَلِ الدُّنْیَا اَکْبَرَ ھَمِّنَا وَلَا مَبْلَغَ عِلْمِنَا. (ترمذی، رقم 3578)

”اے اللہ، ہمارے حصے کی مصیبت ہمارے دین سے متعلق نہ بنانا اور دنیا کو ہمارے عزم و قصد کا مرکز اور ہمارے علم کا منتہا نہ بنانا۔“

یعنی کوئی ناگزیر آزمایش مقدر میں ہو تو وہ دنیا سے ہی متعلق ہو، اس سے ہمارا دین متاثر نہ ہو اور اسی طرح ہمارے عزائم اور ارادوں کا منتہاے مقصود دین ہی رہے، دنیا نہ بن جائے۔

تخریج اور اختلاف طرق

یہ اثر مکمل صورت میں ابن ابی الدنیا کی الاشراف فی منازل الاشراف کے علاوہ بہ ظاہر کسی دوسرے ماخذ میں منقول نہیں۔ البتہ اس کا تیسرا جملہ الورع لابن ابی الدنیا (رقم 45) میں، جب کہ دوسرا اور تیسرا جملہ الزہد لاحمد بن حنبل (رقم 1476) میں بھی منقول ہے۔

[باقی]

نقطۂ نظر

نوا کہ چاہے تو پتھر کو جوئے آب کرے
غیابِ قدرتِ یزداں کو بے نقاب کرے

ڈاکٹر عرفان شہزاد

شورائیت اور ملوکیت

[”نقطۂ نظر“ کا یہ کالم مختلف اصحابِ فکر کی نگارشات کے لیے مختص ہے۔ اس میں شائع ہونے والے مضامین سے ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔]

نظم اجتماعی انسان کی سماجی ضرورت ہے۔ سماجی تعامل کے حدود و قوانین اور تنازعات کے فیصلے کے لیے متفقہ اتھارٹی کا قیام ناگزیر ہے، جس کے فیصلوں کے آگے خواہی نہ خواہی سر تسلیم خم کیا جائے۔ یہ نہ ہو تو دوسری صورت انارکی ہے، جسے معقولیت گوارا نہیں کر سکتی۔ نظم اجتماعی کے قیام کا تقاضا ہی کچھ انسانوں کا اختیار دوسرے انسانوں پر قائم کرنے کا سبب ہے، اس لیے ضروری ہے کہ یہ ان کی مرضی اور انتخاب سے قائم ہو۔ شورائیت یا جمہوریت کی اصل یہی ہے۔ اسی کو اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں کے لیے پسند کیا ہے۔

ارشاد ہوتا ہے:

وَالَّذِيْنَ اسْتَجَابُوْا لِرَبِّهِمْ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ ۠ وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ ۠ وَمِمَّا رَزَقْنٰهُمْ يُنْفِقُوْنَ.
(الشوریٰ 38:42)

”اور وہ کہ جنھوں نے اپنے رب کی دعوت پر لبیک کہی ہے اور نماز کا اہتمام رکھا ہے اور اُن کا نظام اُن کے باہمی مشورے پر مبنی ہے اور ہم نے جو رزق

اُنھیں عطا فرمایا ہے، اُس میں سے (ہماری
راہ میں) خرچ کرتے ہیں۔“

شورائیت سے ماورا یا بے پروا ہو کر اقتدار کو کسی جماعت یا خاندان میں محدود کرنا صاحبان اقتدار کا تجاوز ہے۔ اس سے نہ صرف عوام کا حق انتخاب غصب ہوتا ہے، بلکہ دیگر باصلاحیت لوگوں کو اقتدار میں آکر اپنے جوہر دکھانے کے مواقع بھی مسدود ہو جاتے ہیں۔ اس سے اقتدار کے حریفوں میں تصادم پیدا ہوتا ہے۔ بادشاہتوں کے دور میں طالع آزماؤں کے درمیان کشاکش کی تاریخ بھی اسی کا نتیجہ ہے۔ حکمرانوں کے عزل و نصب کے کسی متفقہ دستور کے بغیر صدیوں تک یہی ہوتا رہا، یہاں تک کہ دستوری حکومتوں کا دور آیا۔ انتخابات کی راہ سے اس مسئلے کو حل کرنے کا سیاسی حل عمل میں آیا۔

تاہم، اللہ تعالیٰ نے شورائیت اختیار کرنے کی صلاح دی ہے، اسے شرعی حکم کا درجہ نہیں دیا کہ اس کی خلاف ورزی شرعی حد کی پامالی کہلائے، جس کے خلاف کسی اقدام کا جواز پیدا کیا جا سکے۔ حالات کا تقاضا ہو تو شرعی احکام میں بھی رخصت دی جاتی ہے، شورائی سیاست کا معاملہ تو شرعی بھی نہیں، خود بنی اسرائیل کے لیے اللہ تعالیٰ نے ملوکیت ہی کو اختیار کیا تھا، کیونکہ ان کے حالات کا تقاضا یہی تھا۔ بنی اسرائیل میں باہمی قبائلی رقابت کسی متفقہ قیادت پر مجتمع نہیں ہو سکتی تھی، انھیں تو طالوت کے انتخاب پر اعتراض تھا، جسے ان کے لیے اللہ نے خود منتخب کیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کو ان کی اجتماعیت مقصود تھی، شورائیت کی صورت میں اجتماعیت برقرار نہ رہتی، چنانچہ انبیا کی موجودگی میں ان کے ہاں موروثی بادشاہت جاری رہی۔

نتیجہ یہ ہے کہ انتخاب اگر شورائیت اور ملوکیت میں ہو تو شورائیت کو منتخب کیا جائے گا، لیکن انتخاب اگر ملوکیت اور انارکی میں ہو تو ملوکیت کا انتخاب ناگزیر ہے۔ جمہوریت کے جدید دور میں بھی ہنگامی حالات میں جمہوری اقدار کو معطل کر دیا جاتا ہے اور ارباب اختیار ہنگامی بنیادوں پر فیصلے کرتے ہیں، جو جمہوری نہیں ہوتے۔

حکومت اگر ظلم اور ناانصافی سے کام لے، چاہے وہ منتخب حکومت ہو یا غیر منتخب بادشاہت، اس کی مذمت اور اصلاح فقط زبان سے کی جا سکتی ہے۔ انفرادی جہاد کا یہی میدان ہے۔ یہاں کلمۂ حق کہنا افضل جہاد ہے۔ اس میں جان بھی چلی جائے تو افضل الشہادت کہلاتی ہے۔ اس سے زیادہ کسی

اقدام کا نہ صرف یہ کہ کوئی حکم نہیں ہے، بلکہ اس سے بڑھ کر کچھ کرنا ممنوع ہے، کیونکہ یہ نہ صرف غیر ضروری ہے، بلکہ نظم اجتماعی کو مختل کرنے کا سبب بنتا، انارکی کو راہ دیتا اور فساد فی الارض پر منتج ہوتا ہے۔ البتہ حکومت کے غیر اخلاقی احکام میں اس کی اطاعت نہیں کی جائے گی۔ پر امن احتجاج کا حق یہیں تک ہے۔

مسلمانوں کی حکومت، خواہ کسی صورت میں بھی قائم ہو جائے، اگر ظالم نہیں، اپنے دینی فرائض سے غافل نہیں، یا کسی بڑے انحراف یا کھلم کھلا کفر پر مُصر نہیں تو کسی فرد یا جتھے کو یہ حق حاصل نہیں کہ اپنے تئیں نظم اجتماعی کی اصلاح یا اسے کسی مثالی صورت میں بحال کرنے کے لیے ہتھیار اٹھالے، خواہ اسے اکثریت کی حمایت بھی حاصل ہو، اس لیے کہ یہ کوئی دینی فریضہ ہی نہیں، جس کے لیے لوگوں کی جان کو خطرے میں ڈالا جائے، بلکہ ایسا اقدام فساد فی الارض کے جرم عظیم کا ارتکاب ہے، خواہ کتنی ہی نیک نیتی سے کیا جائے۔

کسی مصلح یا گروہ کو اپنے اصلاحی اقدام کے لیے اگر اکثریت کی حمایت بھی حاصل نہیں تو اسے خدائی فوج دار بننے کا خبط سرے سے پالنا ہی نہیں چاہیے۔ حکومت کی اصلاح یا کسی مثالی صورت میں اس کی بحالی کے لیے تعلیم اور سیاسی طریقوں سے رائے عامہ ہموار کرنے سے بڑھ کر کسی کارروائی کی کوئی گنجایش دین میں نہیں ہے۔

ارباب حکومت سے مثالی رویے کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اختیار کے ساتھ تجاوزات کا ہونا غیر متوقع نہیں۔ حکمرانوں کے ایسے رویوں کی وجہ سے انھیں اس دعویٰ کی بنیاد پر تبدیل کرنے کی کوئی بنیاد نہیں کہ متبادل قیادت ایسی معصوم، دیانت دار اور متقی ہے جو تجاوزات سے مبرا رہے گی یا اس کے جان نشین لازماً ایسے نیک لوگ ہوں گے جو کوئی تجاوز نہیں کریں گے۔ جب ایسی کوئی ضمانت بھی نہیں دی جا سکتی تو حکومت کی تبدیلی کے لیے اس کے خلاف سازش یا مسلح اقدام کرنے کی کوئی عقلی بنیاد بھی نہیں رہتی۔

سیاست میں بہتری لانے کا طریقہ خیر خواہی کے جذبے کے ساتھ تنقید کرنا اور تعلیم دینا ہے۔

مسلمانوں سے مطلوب سیاسی رویے کے سلسلے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے ارشادات درج ذیل ہیں:

حدثنا أبو النعمان، حدثنا حماد　　　　”حضرت عبد اللہ بن عباس رضی اللہ

بن زيد، عن الجعد أبي عثمان، حدثني أبو رجاء العطاردي، قال: سمعت ابن عباس رضي الله عنهما، عن النبي صلى الله عليه وسلم، قال: ”من رأى من أميره شيئًا يكرهه فليصبر عليه، فإنه من فارق الجماعة شبرًا فمات إلا مات ميتة جاهلية“.

(بخاری، رقم7054)

عنہ سے روایت ہے کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: جس نے اپنے امیر کی کوئی ناپسند چیز دیکھی تو اسے چاہیے کہ صبر کرے، اس لیے کہ جس نے جماعت سے ایک بالشت بھر جدائی اختیار کی اور اسی حال میں مرا تو وہ جاہلیت کی سی موت مرے گا۔“

حدثنا احمد بن عبد الرحمن بن وهب بن مسلم، حدثنا عمی عبد اللّٰه بن وهب، حدثنا عمرو بن الحارث، حدثني بكير، عن بسر بن سعيد، عن جنادة بن ابي امية، قال: دخلنا على عبادة بن الصامت وهو مريض، فقلنا حدثنا: اصلحك اللّٰه بحديث ينفع اللّٰه به، سمعته من رسول اللّٰه صلى اللّٰه عليه وسلم، فقال: دعانا رسول اللّٰه صلى الله عليه وسلم، فبايعناه، فكان فيما اخذ علينا، ان بايعنا على السمع والطاعة في منشطنا ومكرهنا، وعسرنا ويسرنا، واثرة علينا، وان لا ننازع الامر اهله،

”جنادہ بن ابی امیہ سے روایت ہے، کہا: ہم حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ کے پاس حاضر ہوئے، وہ (اس وقت) بیمار تھے، ہم نے عرض کی: اللہ تعالیٰ آپ کو صحت عطا فرمائے، ہم کو ایسی حدیث سنائیے جس سے ہمیں فائدہ ہوا ہو اور جو آپ نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنی ہو، (حضرت عبادہ بن صامت رضی اللہ عنہ نے) کہا: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو بلایا، ہم نے آپ کے ساتھ بیعت کی، آپ نے ہم سے جن چیزوں پر بیعت لی، وہ یہ تھیں کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم سے خوشی اور ناخوشی میں اور مشکل اور آسانی میں اور ہم پر ترجیح دیے جانے کی

قال: إلا ان تروا کفرا بواحا عندکم من اللّٰہ فیہ برهان.
(مسلم، رقم 4471)

صورت میں، سننے اور اطاعت کرنے پر بیعت لی اور اس پر کہ ہم اقتدار کے معاملے میں اس کی اہلیت رکھنے والوں سے تنازع نہیں کریں گے۔ کہا: ہاں، اگر تم اس میں کھلم کھلا کفر دیکھو جس کے (کفر ہونے پر) تمھارے پاس (قرآن اور سنت سے) واضح آثار موجود ہوں۔ (اس صورت میں معصیت کے کاموں میں حکمرانوں کی اطاعت نہیں کی جائے گی، مگر ہتھیار اٹھانے کی اجازت یا حکم نہیں دیا گیا)۔"

اس سلسلے میں ایک روایت سے یہ استدلال کیا جاتا ہے کہ برائی کو ہاتھ سے روکنے کا حکم دیا گیا ہے، اس بنا پر حکومت کی کسی برائی یا فسق کو روکنے کے لیے ہاتھ اور ہتھیار اٹھائے جا سکتے ہیں۔

روایت یہ ہے:

فقال ابو سعید : سمعت رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم، یقول: "من رای منکم منکرًا فلیغیرہ بیدہ، فإن لم یستطع فبلسانہ، فإن لم یستطع فبقلبہ، وذلك اضعف الإیمان". (مسلم، رقم 117)

"ابو سعید رضی اللہ عنہ نے کہا: میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے سنا، آپ فرما رہے تھے: تم میں سے جو شخص منکر (ناقابل قبول کام) دیکھے، اس پر لازم ہے کہ اسے اپنے ہاتھ (قوت) سے بدل دے اور اگر اس کی طاقت نہ رکھتا ہو تو اپنی زبان سے، اور اگر اس کی بھی طاقت نہ رکھتا ہو تو اپنے دل سے (اسے برا سمجھے اور اس کے بدلنے کی مثبت تدبیر سوچے) اور یہ سب سے کم زور

ایمان ہے۔“

اس ارشاد میں برائی کو روکنے یا بدلنے کی ہدایت انسان کی استطاعت سے مشروط ہے۔ یعنی انسان کے دائرۂ اختیار کے اندر منکر یا برائی کو روکنے کی ہدایت اور اس سے اغماض برتنے پر ایمان کی کمی کا الزام دیا گیا ہے۔ اپنے دائرۂ اختیار سے باہر کسی کام کا انسان کو مکلف نہیں ٹھیرایا گیا۔ ہر شخص یا کوئی جتھا اگر یہ کرنے لگے تو یہ خانہ جنگی اور فساد کا سبب ہی بنے گا۔ اسی بنا پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے بعد پیش آنے والے فتنوں کے زمانے میں مسلمانوں کو ہتھیار اٹھانے سے منع فرمایا تھا۔

آپ کا ارشاد نقل ہوا ہے:

حدثنی ابو کامل الجحدری فضیل بن حسین، حدثنا حماد بن زید، حدثنا عثمان الشحام، قال: انطلقت انا وفرقد السبخی إلی مسلم بن ابی بکرة وهو فی ارضه، فدخلنا علیه، فقلنا: هل سمعت اباك یحدث فی الفتن حدیثا؟، قال: نعم سمعت ابا بکرة یحدث، قال: قال رسول اللّٰه صلی اللّٰه علیه وسلم: ”إنها ستکون فتن، الا ثم تکون فتنة القاعد فیها خیر من الماشی فیها، والماشی فیها خیر من الساعی إلیها، الا فإذا نزلت او وقعت، فمن کان له إبل فلیلحق بإبله، ومن کانت له غنم فلیلحق بغنمه، ومن کانت له ارض فلیلحق

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: عنقریب فتنے برپا ہوں گے، سن لو! پھر (اور) فتنے برپا ہوں گے، ان (کے دوران) میں بیٹھا رہنے والا چلنے والے سے بہتر ہو گا، اور ان میں چلنے والا دوڑنے والے سے بہتر ہو گا، یاد رکھو، جب وہ نازل ہوں گے یا واقع ہوں گے تو جس کے (پاس) اونٹ ہوں، وہ اپنے اونٹوں کے پاس چلا جائے، جس کے پاس بکریاں ہوں وہ بکریوں کے پاس چلا جائے اور جس کی زمین ہو، وہ زمین پر چلا جائے۔ (حضرت ابو بکرہ رضی اللہ عنہ نے) کہا: تو ایک شخص نے عرض کی اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اس کے بارے میں کیا خیال ہے جس کے پاس نہ اونٹ ہوں، نہ بکریاں، نہ زمین؟

بارضه"، قال: فقال رجل: يا رسول الله، ارايت من لم يكن له إبل ولا غنم ولا ارض؟، قال: "يعمد إلى سيفه فيدق على حده بحجر، ثم لينج إن استطاع النجاء، اللهم هل بلغت"، اللهم هل بلغت، اللهم هل بلغت. قال: فقال رجل: يا رسول الله، ارايت إن اكرهت حتى ينطلق بي إلى احد الصفين او إحدى الفئتين، فضربني رجل بسيفه او يجيء سهم، فيقتلني، قال: "يبوء بإثمه وإثمك ويكون من اصحاب النار". (مسلم، رقم 7250)

آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: وہ اپنی تلوار لے، اس کی دھار کو پتھر سے کوٹے (کند کر دے) اور پھر اگر بچ سکے تو بچ نکلے! پھر آپ نے فرمایا: اے اللہ! کیا میں نے (حق) پہنچا دیا؟ اے اللہ، کیا میں نے (حق) پہنچا دیا۔ اے اللہ، کیا میں نے (حق) پہنچا دیا۔ ایک شخص نے کہا: اے اللہ کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم، اگر مجھے مجبور کر دیا جائے اور لے جا کر ایک صف میں یا ایک فریق کے ساتھ کھڑا کر دیا جائے اور کوئی آدمی مجھے اپنی تلوار کا نشانہ بنا دے یا کوئی تیر آئے اور مجھے مار ڈالے تو؟ آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا: (اگر تم نے وار نہ کیا ہوا) تو وہ اپنے اور تمھارے گناہ سمیٹ لے جائے گا اور اہل جہنم میں سے ہو جائے گا۔"

مختارات

ہم وہ مے کش ہیں کہ منت کشِ صہبا نہ ہوئے
مانگ لائے ہیں رگِ تاک سے نم اے ساقی

مولانا امین احسن اصلاحی

اخلاص

(ماہنامہ ”صدق“ لکھنؤ، نومبر 1941ء سے انتخاب)

[مختارات کا حصہ قدیم و جدید مصنفین کی منتخب تحریروں کے لیے مخصوص ہے۔ اس کا مقصد ماضی اور حال کے فکر و نظر کو قارئین کے سامنے پیش کرنا ہے۔ اس میں ماضی کے نمایندہ اہل علم کی تصانیف سے ایسے اقتباس نقل کیے جاتے ہیں، جو ان کے افکار اور اسالیب کو نمایاں کرتے ہیں۔ اس کے ساتھ نئے لکھنے والوں کی موثر اور معتبر تحریروں کو بھی شامل کیا جاتا ہے۔ اِس حصے کے مندرجات سے مدیر اور ادارے کا متفق ہونا ضروری نہیں ہے۔ ادارہ]

خلوص، اخلاص، مخلص وغیرہ الفاظ ہماری زبان پر بہت چڑھے ہوئے ہیں۔ ہم جب کسی شخص کے کاموں سے خوش ہوتے ہیں اور اس کی تعریف کرنا چاہتے ہیں تو ان لفظوں میں سے کوئی نہ کوئی لفظ ضرور اس کی تعریف میں لگا دیتے ہیں۔ عموماً تو یہ استعمال کچھ بے جا سا، بلکہ مسرفانہ قسم کا معلوم ہوتا ہے، لیکن بعض اوقات صحیح بھی معلوم ہوتا ہے مثلاً جو لوگ ایک جماعتی کام کرتے ہیں اس کے لیے ہر طرح کی دکھ برداشت کرتے ہیں؛ جیل خانے جاتے ہیں، پولیس کے ڈنڈے

کھاتے ہیں ضبطی املاک و جائداد کے خطرات برداشت کرتے ہیں اور بہ ظاہر اس کے صلے میں اپنی ذات یا اپنے متعلقین کی کوئی منفعت شخصی سامنے نہیں رکھتے۔ ایک اسکول یا کالج کھولتے ہیں، اس کے لیے در در بھیک مانگتے ہیں، اس کو ترقی دیتے ہیں اور مرتے ہیں تو کفن تک کے لیے پیسے چھوڑ کے نہیں جاتے یا کتابیں لکھتے ہیں اور اس سے کوئی تاجرانہ مقصد پیشِ نظر نہیں رکھتے۔ ایسے لوگ اِس بات کے ضرور مستحق ہیں کہ اگر ان کے کاموں میں شہرت طلبی اور خواہشِ نام و نمود کی کوئی کُھلی ہوئی علامت موجود نہ ہو تو ان کو مخلص کہا جائے۔ لیکن ایک بڑی مشکل یہ ہے کہ اگر ایک شخص کو مخلص مانیے تو لوگ اخلاص اور اصابت میں کچھ ایسا منطقی لزوم سمجھتے ہیں کہ پھر آپ سے اس کے افعال کی صحت و حمایت تسلیم کرنے کا بھی مطالبہ کریں گے۔ یہ مطالبہ ذرا ٹیڑھا معلوم ہوتا ہے۔ پہلی بات تو مسامحت کر کے مان لیجیے تو دل پر کچھ ایسی گراں نہیں گزرتی، مگر مچھ کے بعد اس اونٹ کو نگلنا ان طبیعتوں پر شاق ہوتا ہے جو اخلاص کے معنی مطلب سے بے خبر نہیں ہیں، حالاں کہ یہ بہت کھلی ہوئی بات ہے کہ کسی شخص کا اخلاص اس کے عمل کی صحت کو مُستلزم نہیں ہے۔ ہو سکتا ہے کہ ایک شخص اپنے ارادہ میں نہایت مخلص ہو، مگر اُس کا عمل بالکل غلط ہو۔ ماں کی ممتا کتنی غیر مُشتبہ چیز ہے بیٹے کے لیے وہ جو کچھ کرتی ہے سچے مادری جوش کے سوا اور کیا چیز اس کی مُحرّک ہو سکتی ہے، لیکن دیکھیے، یہ اخلاص کتنے بچوں کی جانیں روز لیتا رہتا ہے۔ معلوم ہوا کہ مجرد اخلاص کافی نہیں ہے، بلکہ اس کے ساتھ تو علم بھی ضروری شرط ہے۔ آپ طبیب نہیں ہیں، مگر آپ مریضوں کا علاج شروع کر دیں۔ مذہب سے واقف نہیں مگر فتویٰ نویسی کی مسند بچھا لیں۔ عربی کی الف بے بھی نہیں آتی مگر قرآن پاک کی تفسیر لکھ ڈالیں۔ انجینئر نہیں ہیں مگر پُل بنانے کی ذمہ داری اُٹھا لیں، ڈرائیور نہیں ہیں، مگر موٹر چلانے لگ جائیں تو چاہے کتنے ہی اخلاص کے ساتھ ان کاموں کو انجام دیں مگر آپ کا عمل صحیح نہیں ہو سکتا، اور اگر صحیح ہو گا تو یہ ایک اتفاقی بات ہو گی۔ اور یہ اتفاقی صحت آپ کو ایک خطرناک اقدام کی ذمہ داری سے بری نہیں کرتی۔ آپ اس بات کے مستحق ہوں گے کہ آپ کو امراض دماغی کے کسی شفاخانہ میں بھیجا جائے۔ یہ بات اخلاص و خلوص کے اس مفہوم کو صحیح مان کر کی گئی ہے جو عرف عام میں مشہور ہو گیا ہے۔ لیکن ہم پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ کہتے ہیں کہ اخلاص کا یہ مفہوم غیر قرآنی ہے۔ کسی کام کو صرف اللہ کے لیے انجام دیا جائے، وہ اخلاص کا کام ہے۔ اور جو شخص خالص اللہ کے لیے کسی کام کو کرے، وہ

مخلص ہے۔ اس لفظ کی اصلی روح توحید ہے، چنانچہ سورۂ اخلاص جو توحید کی سورہ ہے اسی وجہ سے سورۂ اخلاص کے نام سے موسوم ہے۔ تمام آیتیں نقل کرنے میں طوالت ہو گی، ہم صرف چند آیتیں محض بہ طور مثال پیش کرتے ہیں:

سورۂ نساء میں ہے: ’وَ اَخۡلَصُوۡا دِیۡنَہُمۡ لِلّٰہِ‘، ’’جنھوں نے اپنی اطاعت اللہ کے لیے خالص رکھی‘‘، ’فَاعۡبُدِ اللّٰہَ مُخۡلِصًا لَّہُ الدِّیۡنَ‘، ’’بس اللہ ہی کی عبادت کرو اُس کے لیے عبادت کو خالص کرتے ہوئے‘‘، ’وَ نَحۡنُ لَہٗ مُخۡلِصُوۡنَ‘، ’’اور ہماری اطاعت اللہ ہی کے لیے خالص ہے‘‘ وغیرہ۔ پس اخلاص کا کام وہ ہے جو اللہ واحد کے لیے کیا جائے۔ اُس میں کوئی اور شائبہ نہ پایا جائے اور مخلص وہ شخص ہو گا جس کے اعمال و افعال کی محرک صرف خدا کی خوشنودی میں ہو۔ وہ بچوں کے منہ میں لقمہ ڈالنے سے لے کر قوموں کی سیادت و قیادت تک جو کچھ کرتا ہو، مجرد رضاے مولیٰ کے داعیہ سے کرتا ہو، اس میں کوئی دغدغہ اور وسوسہ شامل نہ ہو۔ احادیث میں یہ حقیقت نہایت دل آویز لفظوں میں تعبیر ہوئی ہے۔ اور شاہ صاحب نے شرح موطا میں بعض احادیث کے ذیل میں اور ابن قیم نے اپنی تالیفات میں تو ایسی باتیں فرمائی ہیں کہ ان سے روح کو تازگی اور ایمان کو غذا نصیب ہوتی ہے۔ مگر ان لطائف کی تفصیل کے لیے اس مختصر اور سادہ تحریر میں گنجایش نہیں۔

بہرحال قرآن میں اس لفظ کی جو حقیقت ہے، اس سے معلوم ہوا کہ کسی خدمت کو مخلصانہ اور کسی شخص کو مخلص سمجھنے کے لیے تنہا یہ بات کافی نہیں ہے کہ وہ ذاتی مفاد کی آلایشوں سے پاک ہے۔ بلاشبہ جو شخص ہر کام اپنے ہی پیٹ اور تن کے لیے کرتا ہے اور جس کی تمام تگ و دو کا محور اُس کی اپنی ہی ذات ہے، اُس نے حیوانیت کے دائرہ سے قدم باہر نہیں نکالا ہے۔ اور اس کے مقابل میں وہ شخص ایک دوسری حیثیت رکھتا ہے جو ذات کی تنگنائے سے نکل کر خاندان، قوم، ملک، وطن وغیرہ کی وسعتوں میں بڑھ گیا ہے۔ لیکن قرآن کے مفہوم ’’اخلاص‘‘ کو سامنے رکھ کر جب ہم دونوں میں مقابلہ کریں گے تو یہ مقابلہ دو برائیوں میں ہو گا دو اچھائیوں میں نہیں ہو گا۔ یعنی یہ کہیں گے کہ پہلے کے مقابلے میں دوسرا زیادہ اچھا ہے کیونکہ قرآن مجید تنہا یہ نہیں مطالبہ کرتا کہ ایک آدمی اپنی ذات اور شخصیت کی پرستش سے چھوٹ جائے، اس کا مطالبہ تو یہ ہے کہ اللہ کی رضا کے سوا آدمی کے اعمال کے لیے کوئی اور مُحرّک ہی باقی نہ رہے۔ اور اُسی کے لیے جیے

اور اسی کے لیے مرے اور اُسی کی رضا کی تلاش میں ہر لمحہ سر گرم کار رہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو مخلص ہونا تو در کنار اس کے تمام اعمال اللہ کی نظر میں اکارت ہیں۔ ممکن ہے بعض لوگوں کی سمجھ میں یہ بات نہ آئے، مگر ہے بالکل صاف۔

اصل یہ ہے کہ انسان کے اعمال کے لیے اگر صفات وذات کے سوا کوئی اور محرک تسلیم کر لیا جائے تو نہ صرف یہ کہ اس کی تمام روحانی عظمتوں کا خاتمہ ہو جائے گا، بلکہ نیک انسان زمین میں خدا کا خلیفہ ہونے کے بجائے شیطان کا ایجنٹ بن جائے گا۔ جن لوگوں نے خدا کو چھوڑا ہے، ان کے سامنے ان کی ذات سے لے کر قوم ملک تک جتنے اصنام ہیں، ان میں سے کس کے ساتھ رشتۂ اخلاص میں جڑ کر انسان اپنے اعمال کو پاک وصالح بنا سکتا ہے؟

ممکن ہے، آپ جواب دیں کہ قوم وملت، وطن وغیرہ۔ صحیح ہے، اس زمانہ کے سب سے اونچے دیوتا یہی ہیں اور اگر ایک شخص اپنی قوم کا مخلص ہے اور جو کچھ کرتا ہے، وہ قوم ہی کے مفاد کے لیے کرتا ہے تو ہم اُس کے ترانے گاتے ہیں، لیکن اس بات کو بھول جاتے ہیں کہ جو شخص اپنی قوم کا دوست ہے، وہ دوسری قوم کا دشمن ہے۔ افلاطون اور ارسطو بڑے فلسفی اور عقل مند تھے، لیکن افلاطون کی جمہوریت اور ارسطو کی سیاست میں دیکھ لیجیے کہ یہ فلسفی بھی اپنی قوم کے سوا دوسروں کے ساتھ انصاف نہ کر سکے۔ اور ان پرانے فلسفیوں کے نام گنوانے کی ضرورت کیا ہے؟ ہٹلر، مسولینی اور یورپ وامریکہ کے دوسرے آئمۂ سیاست کے اخلاص میں کسے شبہ ہو سکتا ہے؟ ان میں سے ایک ایک اپنی قوم کا جاں نثار ہے اور قوم ووطن ہی ان کے اعمال وافعال کے محرک ہیں، لیکن دیکھیے کہ ان کے اخلاص وطنی وقومی نے آج دنیا میں کیا ہنگامہ مچار کھا ہے اور غور کیجیے تو آپ کو معلوم ہو گا کہ ان میں سے ان کا اخلاص اپنی قوم کے لیے جتنا ہی زیادہ بڑھا چڑھا ہوا ہے، وہ دنیا کے لیے اتنا ہی بڑا عذاب ہے، لیکن اگر یہ وطن وقوم کے بجائے خدا کے مخلص ہوتے تو نہ دنیا پر یہ آفت نازل ہوتی اور نہ خود اُن کی قومیں اس عذاب میں مبتلا ہوتیں۔

خدا کا اخلاص محض تقدس کے لیے ضروری نہیں، بلکہ ایک عملی ضرورت ہے، اس کے بغیر انسان کا جو قدم بھی اٹھے گا، غلط اٹھے گا۔ صرف خدا ہی کے تعلق سے انسان کے دماغ میں وہ روشنی پیدا ہوتی ہے جس سے وہ اپنا اور دنیا کا صحیح مفاد پہچان سکتا ہے۔ اس کے بغیر اگر وہ چلے گا تو کتنا ہی بڑا فلسفی اور زاہد مرتاض کیوں نہ ہو، کسی نہ کسی کھڈ میں ضرور گرے گا، اپنے گھر کی نالی میں

نہیں گرے گا شہر کے چو بچہ میں گر جائے گا، مگر گرے گا ضرور۔

بہر حال دنیا کی قومیں جس کو جی چاہے مخلص کا لقب دے دیں، لیکن مسلمان تو صرف اُسی کو مخلص کہہ سکتا ہے جس کی تلاش زندگی بھر یہ رہی ہو کہ خدا کی مرضی کس بات میں ہے۔ ممکن ہے اس نے اپنے فیصلوں اور کاموں میں نہایت فاش غلطیاں بھی کی ہوں، لیکن یہ اجتہادی غلطیاں ہوں گی۔ اس سے اس کا اجر و ثواب ضائع نہیں جائے گا۔ لیکن جن لوگوں کے پیش نظر خدا کی مرضی کا سوال ہی نہیں ہے، وہ اگر قومی خدمات کے جوش میں اپنے تکے بوٹی کرا دیں تو وہ قومی سرفروش وطنی لیڈر اور نہ جانے کیا کیا کہے جا سکتے ہیں، لیکن جس اخلاص کی تعلیم قرآن مجید نے دی ہے، وہ اخلاص اپنے ساتھ ایک مخصوص نسبت رکھتا ہے اور بغیر اس نسبت کے کسی فعل یا شخص کے لیے اس کا استعمال صحیح نہیں ہے۔

ڈاکٹر عمار خان ناصر / ڈاکٹر سید مطیع الرحمٰن

قرآن و سنت کا باہمی تعلق

(ڈاکٹر عمار خان ناصر کی کتاب "قرآن و سنت کا باہمی تعلق" کے حوالے سے ایک گفتگو)

مطیع سید: آپ نے اپنی کتاب "قرآن و سنت کا باہمی تعلق" میں لکھا ہے کہ خوارج کا فہمِ قرآن، صحابہ کے فہمِ قرآن سے مختلف تھا، کیونکہ ان کے ہاں حدیث سے بے اعتنائی اور سطحیت کا رویہ پایا جاتا تھا۔ آپ نے انھیں الگ کیوں بیان کیا ہے؟ جب ہم ان کے ہاں عملیت دیکھتے ہیں تو عملیت میں تو اخلاص پورا موجود ہے۔ اس کا مطلب ہے کہ وہ اختلاف بھی پورے اخلاص سے کر رہے ہیں، جیسے فقہا کر رہے ہیں۔

عمار ناصر: کر تو وہ اخلاص کے ساتھ ہی رہے ہیں، لیکن اس کے پیچھے جو ان کا دینی فہم ہے، وہ سطحی ہے اور اس سطحیت کو سمجھنے یا اس کا ادراک کرنے کے بجائے ان کے اندر ایک زعم آ گیا ہے کہ ہم بالکل صحیح دین پر کھڑے ہیں اور ہمارے علاوہ باقی جو لوگ ہیں، وہ کفر اور شرک تک پہنچے ہوئے ہیں۔ یہ جو زعم ہے، اس کے ساتھ ظاہری تقویٰ وغیرہ کی اللہ کے ہاں کوئی حیثیت نہیں۔

مطیع سید: اہلِ ظواہر کے ہاں بھی تو یہی سطحیت پائی جاتی ہے۔

عمار ناصر: وہ ایک فقہی اپروچ ہے، اس میں مذہبی رویے کا مسئلہ نہیں ہے۔ مذہبی آدمی میں اللہ تعالیٰ کو خاص طور پر ذاتی رویوں میں مطلوب یہ ہے کہ بندے میں تواضع ہو، انسان Humble ہو۔ اللہ کی طرف کوئی بات منسوب کرنا، اپنے آپ کو خدا کا نمایندہ قرار دینا، اور اس زعم میں مبتلا ہو جانا کہ میں جو بات کر رہا ہوں، یہ گویا خدا بات کر رہا ہے، یہ رویہ ہے جو اخلاقی طور پر اللہ کو ناپسند

ہے۔ ظاہریہ کے ہاں یہ رویہ نہیں ہے۔ ان کے ہاں تو ایک فقہی اپروچ ہے۔ اگر اس کے ساتھ یہ رویہ شامل ہو جائے تو وہ ایک الگ چیز ہے۔ ایسے ہی، جیسے ہمارے ہاں مذہبی لوگ ہیں، ان کے ہاں خوارج کی یا ظاہریہ کی اپروچ نہیں ہے، لیکن بسا اوقات اس طرح کا زعم ان میں بھی پیدا ہو جاتا ہے۔ یہ بھی اللہ کے ہاں اتنا ہی مذموم ہے۔

مطیع سید: گویا یہ تقویٰ اور عملیت بے معنی سی ہو کر رہ جاتی ہیں۔ اس کا کوئی فائدہ ان کو ملنے والا نہیں؟

عمار ناصر: ظاہری عمل کا اللہ نے کیا کرنا ہے؟ اسی کی تو آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نفی کر رہے تھے کہ ان کے قرآن پڑھنے پر، ان کی نمازوں وغیرہ پر نہ جانا کہ وہ کتنے متقی ہیں۔ یہ دیکھنا کہ اصل میں وہ کر کیا رہے ہیں۔ وہ سطحی علم اور کم فہمی کے ساتھ، کس زعم میں مبتلا ہیں کہ جو وہ بول رہے ہیں، قرآن وہی بول رہا ہے اور مقابلے میں صحابہ کی جو پوری جماعت ہے، وہ گم راہ ہے اور کافر ہے۔ یہ رویہ تکبر اور خود راستی کی انتہا کے بغیر پیدا نہیں ہو سکتا۔

مطیع سید: قرآن اور سنت کے باہمی تعلق کے حوالے سے میرے ذہن میں یہ بات آتی ہے کہ اللہ تعالیٰ چاہتے تو چند الفاظ مزید استعمال کر کے کچھ وضاحتیں قرآن میں ہی بیان کر سکتے تھے۔ ایسے لگتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے ارادتاً ہی ایسے رکھا تا کہ اس کی وضاحت نبی صلی اللہ علیہ وسلم کریں تا کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی حیثیت کو نظر انداز نہ کیا جا سکے، یعنی لوگوں میں پیغمبر سے بے نیازی کا رویہ پیدا نہ ہو جائے۔

عمار ناصر: بالکل، یہ پہلو ہو سکتا ہے، البتہ پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ساری چیزیں نہیں کھول دیں۔ ایسے بہت سے اجمالات پھر بھی چھوڑ دیے ہیں۔ اصل میں اللہ تعالیٰ کے ہاں بے نیازی کا اور اس طرح وسعت رکھنے کا انداز ہے کہ بہت اجمال میں، اصول میں ایک بات کہہ دی جائے تا کہ جب وہ اطلاق میں آئے تو اس کی تعبیر کرتے ہوئے گنجایشیں موجود رہیں۔

مطیع سید: اور نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی اسی اصول کو اپنایا؟

عمار ناصر: جی، اسی طرح اپنایا اور کسی حکم کے جو اطلاقی پہلو آپ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے آ گئے، وہ آپ نے واضح فرما دیے۔ جو نہیں آئے، انھیں بعد میں فقہا نے اپنے اپنے طریقوں سے واضح کرنے کی کوشش کی، لیکن گنجایش اللہ تعالیٰ کی طرف سے رکھ دی گئی تھی۔

مطیع سید: آپ نے آیتِ تطہیر کے حوالے سے امام طحاوی رحمہ اللہ کے حوالے سے لکھا ہے کہ وہ بھی اس کو اسی طرح لیتے ہیں، جس طرح اہلِ تشیع لیتے ہیں، یعنی ازواج کو اہل بیت میں شامل نہیں کرتے۔ قرآن تو ان کو شامل کر رہا ہے۔ اتنا واضح سیاق ہونے کے باوجود انھوں نے کیسے حدیث کی وجہ سے آیت کے مصداق سے ازواج کو خارج کر دیا؟

عمار ناصر: بعض صحابہ، مثلاً زید بن ارقم وغیرہ کا بھی بہ ظاہر یہ نقطۂ نظر رہا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ازواج تو ازواج ہیں، لیکن اہل البیت ان سے الگ کیٹیگری ہے۔ مقصد ازواج کی شان میں کمی کرنا نہیں، لیکن یہ کہ ان کی تو اپنی کیٹیگری ہے۔ ازواج النبی کا اپنا امتیازی مقام ہے، لیکن جو اہل البیت کہا گیا ہے، یہ خاص آپ کی اولاد کو کہا گیا ہے۔

مطیع سید: جب قرآن کے الفاظ کو لیا جائے تو وہاں کیا اس معنی کی گنجایش نکلتی ہے؟

عمار ناصر: قرآن کے سیاق میں تو واضح ہے کہ وہاں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواج ہی خصوصاً زیرِ بحث ہیں، البتہ 'اہل البیت' کی تعبیر عام ہے، اس میں اولاد بھی شامل ہے۔ سورۂ احزاب میں براہ راست خطاب تو ازواج سے ہے، لیکن اللہ تعالیٰ نے ان کے بارے میں ارادہ بیان کیا ہے کہ وہ کسی بھی قسم کے الزامات سے، جو ان کی شخصیت کو مجروح کریں، محفوظ رکھنا چاہتا ہے۔ وہی ارادہ اللہ تعالیٰ کا اہل البیت کے باقی افراد کے لیے بھی ہے۔ لیکن یہ کہنا کہ یہاں ازواج مخاطب نہیں ہیں، اس کا کوئی محل نہیں بنتا۔

مطیع سید: آپ نے اپنی اس کتاب میں حدیث و سنت کے بارے میں بہت ساری اپروچز کو لیا ہے، لیکن برصغیر میں سر سید احمد خان، غلام احمد پرویز، احمد الدین امرتسری، اسلم جیراج پوری وغیرہ کی اپروچ کو کیوں نہیں ڈسکس کیا؟

عمار ناصر: میں نے تو اس بات کا اہتمام کیا ہے کہ جو مستند علمی روایت ہے، اس میں یہ گفتگو کیسے آئی ہے، اس کو دیکھا جائے۔ اہل قرآن کی اپروچ تو میرے خیال میں انحرافی اپروچ ہے۔ اگر ہم کوئی عمومی تاریخ لکھ رہے ہوں تو اس میں ان کا ذکر ہو سکتا ہے، وہ الگ چیز ہے۔

مطیع سید: اہل تشیع کے ہاں بھی قرآن و سنت کے باہمی تعلق کی پوری ایک علمی روایت موجود ہو گی، اس کو بھی آپ نے بیان نہیں کیا۔

عمار ناصر: اہل تشیع کی روایت کا مطالعہ میرا موضوع نہیں رہا۔ اس کو بھی شامل کیا جا سکتا تھا،

لیکن اس کا پھر الگ سے مطالعہ کرنا چاہیے۔ ضروری نہیں کہ وہاں بھی یہ بحث اہل سنت کے طریقے پر ہوئی ہو۔ وہ میرے موضوع کا حصہ نہیں ہے۔ ان کے حوالے سے تو پھر بات اور طرح ہو جائے گی۔ اس میں صرف سنت نہیں رہے گی، بلکہ سوال یہ بن جائے گا کہ قرآن، سنت اور ائمۂ اہل بیت کے اقوال کا باہمی تعلق کیا بنتا ہے۔ مطلب یہ کہ گفتگو کے حدود اور سوالات مختلف ہو جائیں گے۔

مطیع سید: ڈاکٹر فضل الرحمٰن کی حدیث و سنت کی اپروچ کو بھی آپ انحرافی کیٹگری میں شامل کرتے ہیں؟ کیونکہ اس کا بھی ذکر آپ نے نہیں کیا۔

عمار ناصر: وہ تو اصل میں اس کو ہی نہیں مانتے کہ احادیث کا جو ذخیرہ ہے، وہ مستند ہے۔ ان کی تو سنت کی تعریف ہی بالکل اور ہے۔ وہ اس علمی روایت کے تسلسل میں کہیں فٹ نہیں ہوتے۔

مطیع سید: ڈاکٹر فضل الرحمٰن سنت کے بارے میں فرماتے ہیں کہ وہ ایک مسلسل عمل تھا جو قابل تغیر تھا، لیکن پھر حدیث کی تحریک نے اسے جامد بنا دیا۔ سوال یہ ہے کہ اگر حدیث کی تحریک اسے نقصان نہ پہنچاتی تو اس کی کیا صورت ہمارے سامنے آتی؟ کیا فوائد و ثمرات ہیں جو ہم سمیٹ لیتے اگر یہ تسلسل جاری رہتا، اور اس تحریک کی وجہ سے کیا نقصانات ہوئے؟

عمار ناصر: ڈاکٹر فضل الرحمٰن کہنا یہ چاہتے ہیں کہ سنت تو اصل میں اجتہاد پر مبنی ایک عمل تھا۔ اجتہاداً مسلمان معاشرہ ایک طریقہ اختیار کرتا تھا اور وہ ساتھ ساتھ بدلتا رہتا تھا۔ اس میں ایک طریقہ اختیار کر لیا جانا اور اس کا بدلتے رہنا، یہ دونوں چیزیں ساتھ ساتھ چل رہی تھیں۔ اگر وہ چلتا رہتا تو کہیں جمود نہ آتا، یعنی اس طرح کی کوئی پابندی نہ ہوتی کہ فلاں چیز نہیں بدلی جا سکتی۔ جب حدیث غالب آ گئی تو اس نے ایک اجتہادی معاملے کو نص میں ڈھال دیا۔ پھر اس سے آگے بڑھنے کے لیے بحث پیدا ہو گئی کہ ہم اس کو بدل سکتے ہیں یا نہیں۔ ہم نص کو چھیڑ سکتے ہیں یا نہیں۔ سادہ طور پر وہ یہ کہنا چاہ رہے ہیں۔

مطیع سید: آپ اس نقطۂ نظر کو کیسے دیکھتے ہیں؟

عمار ناصر: مجھے ان کا یہ نکتہ تو درست نہیں لگتا کہ سنت اصل میں کلیتاً ایک اجتہادی معاملہ تھا۔ اس کے پیچھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی کوئی ہدایات نہیں تھیں، یہ سر تا سر مسلمان معاشرے کا اختیار کردہ عمل تھا۔ مجھے اس سے اختلاف ہے۔ بہت سی چیزیں یقیناً اجتہادی تھیں، کلچرل تھیں، عرف پر مبنی تھیں، لیکن بہت سی چیزوں کے پیچھے نبی صلی اللہ علیہ وسلم کی دی ہوئی

ہدایات بھی تھیں۔ تو مجھے یہاں اختلاف ہے کہ یہ سارا تعامل کلیتاً اجتہادی نہیں تھا، اس میں کئی چیزوں کے پیچھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہدایات بھی تھیں۔ کچھ معاملات میں آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے باقاعدہ سنت قائم فرمائی تھی اور کچھ کے متعلق آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے رہنمائی کے لیے ارشادات فرمائے تھے اور ان کو جب مسلمانوں نے بڑے پیمانے پر اختیار کر لیا تو وہ بھی ایک معمول بن گئیں، یعنی ایک طرح سے سنت کا درجہ انھیں حاصل ہو گیا۔

مطیع سید: لیکن ان کی جو دوسری بات ہے کہ جزوی معاملات سے متعلق اگر احادیث مدون نہ ہوتیں تو اجتہادی عمل زیادہ متحرک انداز میں جاری رہتا، اس کے متعلق آپ کی کیا راے ہے؟

عمار ناصر: اس سے میرے خیال میں کسی حد تک اتفاق کیا جا سکتا ہے۔ دراصل امت میں دو رجحان تھے۔ اکابر صحابہ کے ہاں احادیث کو مدون نہ کرنے کے پیچھے ایک بڑا محرک یہ نظر آتا ہے کہ احادیث بنیادی طور پر مخصوص صورت حال میں دی گئی ہدایات ہیں۔ خود نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے بھی غالباً اسی وجہ سے اس کا اہتمام نہیں فرمایا کہ آپ کی ہر ہر بات محفوظ ہو کر امت تک پہنچے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی بات تو ظاہر ہے، ایک اتھارٹی کا درجہ رکھتی ہے۔ آپ صلی اللہ علیہ وسلم بھی نہیں چاہتے تھے اور اکابر صحابہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ کوئی ایسی پابندی امت پر عائد ہو جائے جو شریعت کا مقصود نہیں۔ لیکن ایک دوسرا رجحان صحابہ میں یہ تھا کہ آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی ہر ہر بات معلوم ہونی چاہیے، ہمیں اس پر عمل کرنا چاہیے، اور اسے آگے پہنچانا چاہیے۔ عملاً یہی رجحان امت میں غالب رہا ہے۔ لیکن فرض کریں، اس کے الٹ ہو جاتا تو ایسا نہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے منشا کے خلاف ہو جاتا یا احادیث کا یہ سارا ذخیرہ محفوظ نہ ہونے سے دین کا کوئی ضروری حصہ ہم سے ضائع ہو جاتا۔

بہر حال کئی چیزوں کے بارے میں آپ کہہ سکتے ہیں کہ جب وہ احادیث کی صورت میں محفوظ ہو گئیں تو پھر اجتہاد کی گنجایش، محدثین کے ہاں یا جو محدثین کے قریب تر مکاتب فکر ہیں، ان کے ہاں اس طرح نہیں مانی گئی۔ لیکن محدثین کے علاوہ ہماری روایت میں مالکیہ بھی رہے ہیں، احناف بھی رہے ہیں، انھوں نے اسی نزاکت کو ملحوظ رکھتے ہوئے احادیث کو اور اخبارِ آحاد کو استعمال کرنے میں کئی مختلف فلٹر لگا دیے۔ تو میرا خیال ہے کہ حدیث تحریک کو جس فقہی جمود کا ذمہ دار ٹھیرایا جاتا ہے، اس میں کافی مبالغہ ہے۔ مجموعی طور پر اس سے اجتہادی عمل میں کوئی بڑی

رکاوٹ پیدا نہیں ہوئی۔ فقہی روایت نے خاص طور پر مالکیہ اور احناف نے کافی چھلنیاں لگا دی ہیں۔ کسی خبر واحد سے کوئی ایسا اصول جو قطعی یا غیر متبدل ہو اور ہر طرح کے حالات کے لیے واجب الاتباع ہو، آسانی سے اخذ نہیں کیا جا سکتا۔ بہت سی چیزیں دیکھنی پڑتی ہیں۔

مطیع سید: اپنے نقطۂ نظر کے حق میں ڈاکٹر فضل الرحمٰن اکثر حضرت عمر رضی اللہ عنہ کی مثالیں دیتے ہیں۔ میں یہ کہتا ہوں کہ اب حضرت عمر رضی اللہ عنہ جیسی شخصیت کہاں سے لائیں؟ ان کی حیثیت، طبیعت و مزاج، طبعی رجحان اور جرأت، مجھے تو ان کے فوراً بعد بھی اس طرح کی کوئی شخصیت نظر نہیں آتی۔ تو ان کی مثال ہم کیسے پیش کر سکتے ہیں؟

عمار ناصر: یہ بات آپ کی صحیح ہے۔ ڈاکٹر فضل الرحمٰن یا اس طرح کے حضرات کچھ سادہ فکری کا انداز اختیار کر لیتے ہیں۔ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے جس سطح کے اجتہادات کیے اور ان کو صحابہ کے ہاں ایک قبول عام حاصل ہو گیا، پھر بعد میں فقہا نے بھی عام طور پر ان سے کوئی مختلف راستہ اختیار نہیں کیا۔ بات یہ ہے کہ اس سطح کے اجتہاد کے لیے بندہ بھی تو اسی سطح کا چاہیے۔ جب ہم چیزوں کو بہت آئیڈیل انداز میں دیکھنے لگتے ہیں تو کئی عملی نزاکتوں کو ملحوظ نہیں رکھتے۔

مطیع سید: پھر وہ صحابہ کے رد و قبول کا بھی سامنا کر رہے تھے، یعنی ایسا نہیں ہے کہ صحابہ نے ان کے ہر اجتہاد کو فوراً قبول کر لیا۔

عمار ناصر: جی، کئی چیزوں میں صحابہ نے سخت اختلاف کیا اور اس کا حضرت عمر جیسی شخصیت نے ہی سامنا کیا۔

مطیع سید: حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے اجتہادات پر جو تنقید صحابہ کی طرف سے ہوئی یا ردِ عمل ہوا، اس سے تو لگتا ہے کہ متحرک اجتہاد کا یا تسلسل کا تصور وہ نہیں تھا جو ڈاکٹر فضل الرحمٰن بتاتے ہیں۔

عمار ناصر: جی ایسا ہی ہے۔ جس زاویے سے سیدنا عمر اجتہاد کر رہے تھے، اس سے سارے صحابہ بھی اتفاق نہیں کر رہے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ یہ فرض کر لینا کہ فطری طور پر تو ایک ہی طرح سے اجتہاد کا عمل آگے بڑھ رہا تھا اور پھر کسی شخصیت نے یا حدیث تحریک نے مصنوعی طور پر اس کا راستہ روک دیا، یہ بات درست نہیں ہے۔

مطیع سید: ڈاکٹر صاحب کی اگر سنت کے مسلسل متغیر رہنے والی بات مان لیں، تو کیا اس سے نبی

صلی اللہ علیہ وسلم کی اطاعت ایک بہت محدود دائرے میں نہیں رہ جاتی؟ اس صورت میں نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرامین ایک تاریخی پراسس کا حصہ بن جاتے۔ اب جیسے ان کی ایک الگ سے حیثیت ہے، وہ شاید نہ ہوتی۔

عمار ناصر: رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت سے اس طرح تصریحاً تو ہمارے پاس چیزیں نہ ہوتیں، لیکن بالواسطہ وہ مسلمانوں کے تعامل پر اثرانداز ہو رہی ہوتیں۔ ہاں، یہ فرق ضرور واقع ہوتا کہ ان پر بعد میں سوال اٹھانا آسان ہوتا۔ اس تعامل کو ہم عرف پر مبنی سمجھتے اور عرف تو تبدیل ہو سکتا ہے۔

مطیع سید: اور ڈاکٹر صاحب بھی یہی چاہتے ہیں؟

عمار ناصر: جی، وہ بھی یہی چاہتے ہیں کہ احادیث کا کردار پس منظر میں رہتا اور مسلمانوں کا تعامل عرف کی حیثیت سے متغیر اور لچک دار رہتا تو آج ہمیں آسانی ہوتی۔

مطیع سید: ایک اور حوالے سے اگر دیکھیں تو موجودہ دور میں کئی احادیث کی قابل فہم توجیہ نہیں ہو پاتی، لیکن عام طور پر علما پورے ذخیرۂ حدیث کے دفاع کو دینی طور پر بہت ضروری سمجھتے ہیں۔ کچھ مخصوص حدیثوں پر بھی کوئی سوال اٹھایا جائے تو ان کو لگتا ہے کہ اس سے پورے ذخیرہ کی حیثیت کو مشکوک بنانے کا راستہ کھولا جا رہا ہے۔

عمار ناصر: اصل میں اگر زاویۂ نظر یا مقصد کا فرق سمجھ لیا جائے تو یہ دونوں پوزیشنز قابل فہم بنتی ہیں۔ اگر آپ ایک زاویے سے دیکھیں تو علما کے موقف میں ایک وزن ہے، اور جس طرح آپ سوچ رہے ہیں، اس طرح سے سوچنے والے لوگوں کی پوزیشن بھی درست ہے، اگر ایک دوسرے مسئلے کو سامنے رکھا جائے۔ علما کا کہنا یہ ہے کہ ہمیں روایت سے جو ایک موقف یا ایک رجحان ملا ہے اور اس میں دینی اصولوں کے اعتبار سے کوئی بڑا مسئلہ بھی نہیں، ہمیں اسی پر قائم رہنا چاہیے۔ لوگوں کو اس سے اطمینان نہیں ہوتا تو یہ کوئی مسئلہ نہیں ہونا چاہیے، کیونکہ جدید ذہن کی سمجھ میں تو قرآن کی بھی بہت سی باتیں نہیں آتیں۔ اگر آپ یہاں سے دیکھیں تو ان کی بات ٹھیک لگتی ہے۔ لیکن اگر آپ دوسرے زاویے سے دیکھیں کہ دین کو آپ کو لوگوں کے سامنے پیش کرنا ہے، اور دعوت میں یہ چیز بڑی اہم ہوتی ہے کہ ایسی زائد چیزیں یا ایسی تفصیلات جو بنیادی دعوت کو قبول کرنے میں مخاطب کے لیے رکاوٹ بن جائیں یا غیر ضروری سوالات پیدا کریں، ان پر اصرار نہ کیا جائے۔ اگر آپ لازمی

قرار دیں کہ ان تمام جزئیات اور تفصیلات کو بھی لوگ ایسے ہی من وعن مانیں، اور اس سے اصل دین یا اس کی دعوت مجروح ہو تو یہ درست حکمت عملی نہیں ہے۔

میں نے دیکھا، کئی پختہ اہل علم بھی اس کا ادراک رکھتے ہیں کہ احادیث کے وسیع ذخیرے میں جتنی تفصیلات اور جزئیات آئی ہیں، آج کے دور میں اگر ان سب پر ایمان لانے کو دعوت دین کا لازمی جزو بنایا جائے تو اس سے دین کی دعوت کو بہت نقصان پہنچے گا۔ اس ذخیرے میں تاریخی نوعیت کی چیزیں بہت ہیں، بالمعنی روایت کی وجہ سے راویوں کے قیاسات کا بہت بڑا حصہ ہے۔ بہت سی ایسی تفصیلات اور جزئیات ہیں جو اگر ہمارے سامنے نہ بھی ہوں تو دین کی دعوت اپنی جگہ پھر بھی مکمل ہے۔ تو ان حضرات کے زاویۂ نظر میں آپ کو ذخیرۂ حدیث کے حوالے سے زیادہ لچک اور وسعت دکھائی دیتی ہے۔

مطیع سید: غامدی صاحب بھی چیزوں کو historicize کرتے ہیں، اور ڈاکٹر فضل الرحمٰن بھی کرتے ہیں۔ ان کے ہاں فرق کہاں سے پیدا ہوتا ہے؟

عمار ناصر: ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے ہاں تاریخیت کا دائرہ، حلال وحرام کے کچھ بڑے احکام کو چھوڑ کر، قرآن کے تقریباً سبھی احکام تک پھیل جاتا ہے، خاص طور پر جن کا تعلق معاشرے سے ہے۔ قرآن خود اپنی ہدایات کو کس پہلو سے بیان کر رہا ہے، اس میں نص کے داخلی قرائن وشواہد کیا ہیں، ان کو وہ ثانوی حیثیت میں لے جاتے ہیں۔ غامدی صاحب بھی اپنے منہج میں قرآن کے بعض احکام کی تفہیم خاص سیاق میں کرتے ہیں، لیکن وہ یہ کہتے ہیں کہ اس کا قرینہ یا اس کے شواہد ہمیں حکم کے اندر سے ملتے ہیں، حکم کے باہر سے تخصیص نہیں کی جائے گی۔ مثلاً گھروں سے باہر نکلتے ہوئے خواتین کو یہ ہدایت دی گئی کہ وہ ایک بڑی چادر لے کر اپنے جسم کو چھپا لیں، اس کے ایک مخصوص صورت حال سے متعلق ہونے کے قرائن ہمیں حکم کے اندر سے مل جاتے ہیں۔ اس کے برعکس، یہ حکم کہ چور کا ہاتھ کاٹنا ہے، اس کے متعلق یہ کہنا کہ یہ بھی ایک وقتی حل تھا اور جرم کو روکنے کا ایک ممکنہ طریقہ بتایا گیا ہے، اس کے قرائن ہمیں قرآن کے اندر نہیں ملتے۔ حکم میں تو کہا گیا ہے کہ یہ سزا اللہ کی طرف سے عبرت کے طور پر مقرر کی گئی ہے، یعنی یہ کوئی انتظامی حکم نہیں ہے، اس کا تعلق حقوق اللہ سے ہے۔ تو غامدی صاحب دونوں طرح کے احکام میں فرق کریں گے، ڈاکٹر فضل الرحمٰن کے ہاں یہ فرق ملحوظ نہیں ہے۔

مطیع سید: قرآن کے کئی موضوعات کا حدیث میں بالکل ذکر نہیں ملتا۔ مثلاً 'سنت اللہ' کا لفظ ذخیرۂ احادیث میں نظر نہیں آتا۔ قرآن تو اس کا بڑی اہمیت سے ذکر کرتا ہے، لیکن نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے اس طرح اس کو موضوع نہیں بنایا۔ کسی صحابی نے بھی اس پر کوئی سوال نہیں کیا۔

عمار ناصر: یہ تو آپ کو کئی چیزوں میں فرق محسوس ہوتا ہے۔ قرآن کے موضوعات میں اور حدیث کے موضوعات میں کافی فرق ہے۔ کئی عملی مسائل ہیں اور معاملات ہیں جنھیں پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم نے ہی موضوع بنایا ہے۔ قرآن میں وہ اس طرح سے موضوع نہیں ہیں۔

مطیع سید: اس فرق کی وجہ کیا ہو سکتی ہے؟

عمار ناصر: یہ بھی اسی طرح کا سوال ہے کہ شارع کی اغراض کیا ہیں۔ یعنی کیا ہم کوئی کلیہ یا تھیوری بنا سکتے ہیں کہ جب اللہ ہدایت کے لیے پیغمبر کو بھیجتا ہے اور ساتھ کتاب بھی اتارتا ہے تو ان دونوں کا باہمی تعلق کیا ہوتا ہے؟ اصولِ فقہ میں جو بحث ہے، وہ اس سوال کے بہت ہی محدود حصے کو موضوع بناتی ہے۔ وہ یہ کہ کسی ایک موضوع پر اگر دونوں جگہ بات کی گئی ہے، وہ بات قرآن میں بھی ہے اور حدیث میں بھی ہے، لیکن بالکل ایک جیسی نہیں ہے، بلکہ اس میں کچھ فرق ہے تو اس کا باہمی تعلق ہم کیسے طے کریں؟ یہ بہت ہی محدود سا پہلو ہے اور وہ بھی پوری طرح اصولیین کی گرفت میں نہیں آتا۔ میں نے اس پر تفصیلی کتاب لکھ دی ہے۔ سبھی علمائے اصول اس کا فریم ورک بنانے کی کوشش کر رہے ہیں۔ تو بہت سی چیزیں ہیں جن کو کتاب اللہ موضوع ہی نہیں بناتی، سنت میں وہ مسلسل زیرِ بحث ہے۔ اسی طرح کئی چیزیں ہیں جن کو سنت موضوعِ بحث بناتی ہے، لیکن کتاب اللہ ان کو مس نہیں کرتی۔

مطیع سید: جیسے حضرت مسیح علیہ السلام کے دوبارہ آنے کی بات کتاب اللہ نہیں کرتی۔

عمار ناصر: اس کی بھی نہیں کرتی، اور اشراط الساعۃ کا پورا باب یا بعد کے دور میں خارق عادت واقعات کا ذکر، قرآن میں بالکل نہیں ہے۔ ایک آدھ جگہ اشارتاً یاجوج وماجوج کے خروج کا ذکر ہے۔ اسی طرح لوگوں کی انفرادی تربیت کے اور اخلاق کے مسائل ہیں۔ قرآن میں تو بہت اصولی سی باتیں ہیں، لیکن یہ حدیث کا خاص موضوع ہے۔ فقہی احکام اور ان کی تفصیلات کا بھی یہی معاملہ ہے۔ کچھ چیزوں کے متعلق غامدی صاحب نے توجیہ کی ہے کہ وہ کیوں قرآن میں نہیں ہیں۔ مثلاً وہ کہتے ہیں کہ سنت میں جو چیزیں شامل ہیں، ان کا تصور اور کوئی نہ کوئی عملی صورت پہلے

سے معروف تھی۔ لوگ جانتے تھے، اس لیے قرآن کو انھیں بیان کرنے کی ضرورت نہیں تھی۔ نبی صلی اللہ علیہ وسلم چونکہ مامور تھے کہ اس کی تجدید کریں، اس کو نئی شکل دیں تو یہ ذمہ داری آپ نے ہی انجام دی۔

مطیع سید: حدیث میں پھوپھی اور بھتیجی اور خالہ اور بھانجی کو بھی بہ یک وقت نکاح میں جمع کرنے کی ممانعت آئی ہے۔ غامدی صاحب کہتے ہیں کہ نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح قرآن سے اس کو اخذ کیا ہے، یہ اس قدر واضح تھا کہ کوئی بھی عالم اس طرح اخذ کر لیتا۔ اس پر اطمینان نہیں ہوتا۔ کیسے کوئی عالم اتنی آسانی سے یہ اخذ کر سکتا ہے؟

عمار ناصر: یہ بات ٹھیک ہے۔ اتنی بات درست ہے کہ جب نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے قرآن سے یہ استنباط کر لیا تو ہم غور کر کے سمجھ سکتے ہیں کہ ممانعت کی علت کو یا اس کی روح کو سامنے رکھتے ہوئے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کی توسیع کی ہے۔ چاہے آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے اجتہاداً ایسا کیا اور اللہ تعالیٰ نے اسے قبول کر لیا اور چاہے اللہ تعالیٰ کی طرف سے آپ صلی اللہ علیہ وسلم کی رہنمائی کی گئی۔ توسیع ہو جانے کے بعد تو یہ سمجھا جا سکتا ہے، لیکن یہ کہنا مشکل ہے کہ اگر آپ صلی اللہ علیہ وسلم نہ کرتے تو حکم از خود اتنا واضح تھا کہ کوئی بھی فقیہ اسے اخذ کر لیتا۔

مطیع سید: بالکل، اور اگر کوئی اخذ کر بھی لیتا تو اس کی وہ حیثیت نہیں ہو سکتی تھی جو نبی صلی اللہ علیہ وسلم کے فرمان کی ہے۔

عمار ناصر: ایسا ہی ہے۔ مثلاً جو جانوروں کی حرمت والی آیت ہے، اس میں اگر آپ قرآن کی نص کو ظاہراً دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ان چار چیزوں کے علاوہ سب جانور حلال ہیں۔ اس ظاہری مفہوم کی وجہ سے صحابہ میں اختلاف پیدا ہو گیا کہ حدیث میں گدھے اور کچھ دوسرے جانوروں کے گوشت کی جو ممانعت کی گئی ہے، کیا وہ ان کے حرام ہونے کی وجہ سے ہے یا کوئی اور وجہ ہے۔ مطلب یہ کہ قرآن کی بیان کردہ حرمت کی قیاساً توسیع کرنا اتنا آسان نہیں تھا۔ میرے خیال میں اگر پھوپھی اور بھانجی سے متعلق بھی حدیث میں ممانعت نہ آتی تو حکم کی علت خود اتنی واضح نہیں تھی کہ کسی فقیہ کا ذہن آسانی سے اس طرف متوجہ ہو پاتا۔

مطیع سید: حدیث کے متعلق غامدی صاحب کا جو موقف ہے، اپنی کتاب ''میزان'' میں انھوں نے اس کی روشنی میں پورا دین بیان کیا ہے۔ میں نے بعض اہل علم سے یہ سوال کیا کہ اگر ہم غامدی

صاحب کا موقف مان لیں تو اس سے دین میں کیا نقص واقع ہوتا ہے یا دین کا کون سا ایسا حصہ ہے جو چھوٹ جاتا ہے؟ انھوں نے فرمایا کہ اس سے دین میں حدیث کی اہمیت کم ہو جاتی ہے۔

عمار ناصر: مثلاً کیسے کم ہوتی ہے؟

مطیع سید: ان کے نزدیک حدیث شریعت میں کوئی مستقل حکم بیان نہیں کر سکتی۔ اس لیے پھر انھیں احادیث کو قرآن سے ماخوذ دکھانے کے لیے تگ و دو کرنی پڑتی ہے۔

عمار ناصر: یہ تو حدیث کو معناً قرآن سے مربوط کرنے کے طریقے میں اختلاف ہوا۔ حدیث تو انھوں نے لے لی ہے، اس کے لینے کا طریقہ مختلف ہے۔ اس سے حدیث کی اہمیت کم کیسے ہو گئی؟

مطیع سید: انھوں نے کچھ اور چیزیں بھی بیان کیں کہ ہمیں ان کے بارے میں یہ کہنا پڑے گا کہ یہ دین نہیں ہیں۔ جیسے ڈاڑھی رکھنے کو غامدی صاحب دینی حکم نہیں مانتے تو اس طرح شریعت کی بہت ساری جزئیات ہمیں چھوڑنی پڑیں گی۔

عمار ناصر: جزئیات میں اور اطلاق میں تو اختلاف ہو سکتا ہے۔ بعض جزئیات شاید غامدی صاحب کے فریم ورک میں اس طرح فٹ نہیں بیٹھتی، جیسے دوسرے اہل علم کے ہاں بیٹھتی ہیں۔ اس قسم کی چیزیں تو پرانے فقہا کے ہاں بھی ہیں۔ متقدمین احناف کے ہاں آپ کو مثلاً عقیقے سے متعلق اسی قسم کا زاویۂ نظر ملے گا کہ یہ کوئی شریعت کی مقرر کردہ رسم نہیں ہے، یہ بس اہل عرب کا ایک رواج تھا۔ تو جزئیات میں تو ہمیشہ بحث اور اختلاف کی گنجایش رہتی ہے۔

مطیع سید: آپ نے کتاب میں احادیث احکام کو موضوع بنایا ہے اور نوے فی صد سے بھی زائد احکامی آیات و احادیث کے مابین تعلق کو بہ طور مثال بیان کیا ہے، لیکن بعض ایسی روایات ہیں جن کا تعلق عقائد سے ہے، اور اس میں ایسی باتیں بیان ہوئی ہیں جو بہ ظاہر قرآن سے ٹکرا رہی ہوتی ہیں۔ آپ نے ایسی روایات بہت ہی کم ذکر کی ہیں۔ میرے خیال میں تو وہ فقہی روایات سے زیادہ اہم ہیں۔

عمار ناصر: اکا دُکا چیزیں جو اعتقادی نوعیت کی ہیں، ان کا بھی ذکر ہوا ہے، مثلاً یہ کہ گناہ گار جہنم سے نکل سکتا ہے یا نہیں۔ قرآن میں کفار کے بارے میں جو آیات ہیں، ان سے خوارج وغیرہ نے سمجھا کہ مومن بھی کبھی جہنم سے نہیں نکل سکتے۔ لیکن اعتقادی مباحث میں احادیث کی حیثیت ایک الگ موضوع بن جاتا ہے۔ میں نے کتاب کو اس بحث تک محدود رکھا ہے جو فقہی احکام کے

حوالے سے امت میں چلی آ رہی ہے۔

مطیع سید: کیا عقائد کے حوالے سے اس طرح بحث رہی نہیں؟

عمار ناصر: عقائد کے حوالے سے بھی اس طرح کی بحث رہی ہے اور اس پر مستقل اور تفصیلی مباحث موجود ہیں۔ یہ مسئلہ علم الکلام میں زیر بحث آتا ہے کہ اخبارِ آحاد اگر ظاہر اًقرآن سے ٹکرا رہی ہوں تو ان کو لیا جائے گا کہ نہیں؟ دوسرا یہ کہ اخبارِ آحاد سے ہم اعتقادی مسائل اخذ کر سکتے ہیں یا نہیں؟ اگر ہم عمومی طور پر خبرِ واحد پر بات کر رہے ہوں کہ اس کی قبولیت کن دائروں میں ہے اور کن میں نہیں تو وہاں یہ سوال بھی زیر بحث آ سکتا ہے۔ اس پر ایک الگ کتاب بھی لکھی جا سکتی ہے۔

مطیع سید: اس کتاب میں آپ کا اپنا موقف زیادہ واضح انداز میں سامنے نہیں آیا۔ میرے خیال میں تو آپ کا اپنا ایک مستقل نقطۂ نظر ہے۔

عمار ناصر: جی، میں بعض پہلوؤں سے اس بحث کو ذرا مختلف انداز میں دیکھتا ہوں۔ پہلے خیال تھا کہ کتاب کے آخر میں اس کا ذکر کر دیا جائے، لیکن شاید اس پر میں الگ سے کچھ چیزیں لکھوں گا۔ ہو سکتا ہے، وہ کتاب کا دوسرا حصہ بن جائے۔ اس کتاب میں بھی کچھ بحثیں تشنہ ہیں۔ ان پر بھی میں نے کچھ لکھنا شروع کیا ہے۔

تحریر: علامہ شبیر احمد ازہر میرٹھی

ترتیب: ڈاکٹر محمد غطریف شہباز ندوی

’اِنۡ جَآءَکُمۡ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ‘ کی شان نزول کی تحقیق

کیا ولید بن عقبہ فاسق تھے؟

(1)

[تفسیری روایات کا بڑا حصہ امام ابن تیمیہ کے نزدیک مراسیل پر مشتمل ہے۔ لان الغالب علیھا المراسیل۔[1] یہ تفسیری روایات فہمِ قرآن میں بسا اوقات رکاوٹ بن جاتی ہیں۔ البتہ ان میں سے بعض روایات قرآن کریم کی تفہیم میں مدد بھی دیتی ہیں۔ یہ کہنا بے جا نہ ہو گا کہ اسلام کے مجموعی فہم کو اِن روایات نے بہت متاثر کیا ہے۔ ان میں سے ایک روایت کی تحقیق ذیل میں پیش کی جا رہی ہے، جو علامہ شبیر احمد ازہر میرٹھی کے رشحاتِ قلم سے ہے اور ان کی زیر طبع تفسیر ”مفتاح القرآن“ سے ماخوذ ہے۔ ان کی یہ تفسیر اس لحاظ سے پورے تفسیری ذخیرہ میں منفرد ہے کہ انھوں نے بہت ساری تفسیری روایات کا حدیث کے مسلمہ اصولوں کی روشنی میں دقتِ نظر سے جائزہ لیا ہے۔ خاکسار نے اس مضمون میں تین چار جگہوں پر حوالوں کو مکمل کر دیا ہے۔ محمد غطریف شہباز ندوی]

---

[1]۔ شرح مقدمہ فی اصول التفسیر لابن تیمیہ 73، شارح صالح بن عبد العزیز آل الشیخ، مکتبہ دار المنہاج للنشر والتوزیع طبع 1431ھ۔

خیبر فتح ہو جانے کے بعد اہل ایمان کی قوت اہل عرب میں ایک مسلم حقیقت بن چکی تھی۔ قبائل عرب جو ہمیشہ ایک دوسرے سے لڑتے اور لوٹ مار کرتے رہتے تھے، مسلمانوں کے زیر حمایت آجانے اور اپنے حریف قبائل کے خلاف انھیں مشتعل کر دینے کی فکر میں پڑ گئے۔ اس مقصد کے تحت کسی قبیلہ کا جو وفد آتا، وہ اپنے حریف قبیلہ کے متعلق مسلمانوں کو اشتعال انگیز خبریں سناتا کہ وہ قبیلہ اس گھات میں ہے کہ کوئی زبردست قبیلہ مسلمانوں سے ٹکرا لے تو جان ومال سے اس کا ساتھ دیں۔ مسلمانوں کے متعلق وہ یہ کہتے ہیں، رسول اللہ کے متعلق یہ بکواس کرتے ہیں۔ مقصود ان اطلاعات سے یہ ہوتا کہ اہل اسلام مشتعل ہو کر اس قبیلہ پر چڑھ دوڑیں۔ اللہ تعالیٰ نے بروقت مومنین کو متنبہ فرمایا کہ غیر معتبر لوگوں سے سنی ہوئی ان باتوں کا جو دوسرے لوگوں کے خلاف ہوں یقین نہ کریں، بلکہ اپنے طور پر اس کی تحقیق کر لیں۔ اگر تحقیق سے ان کی دی ہوئی خبر صحیح ثابت ہو تو مناسب اقدام کریں۔ تحقیق کے بغیر محض کسی غیر معتبر شخص کی دی ہوئی اطلاع پر اقدام کر ڈالو گے تو ممکن ہے اس کے نتیجہ میں تمھیں ندامت اٹھانی پڑے۔

ممکن ہے، وہ قبیلہ تمھارا خیر خواہ ہو یا اس میں در پردہ کچھ لوگ مسلمان ہوں۔ غیر معتبر لوگوں کی بات پر یقین کر لینے کا یہ نتیجہ بھی نکل سکتا ہے کہ تم رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے اس قبیلہ کے خلاف فوجی اقدام کرنے کو کہو گے، مگر آپ حکم حق کے بغیر کوئی اقدام کریں گے نہیں تو تمھیں خیال ہو گا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہماری بات نہیں مانی۔ آپ کے نزدیک ہماری کوئی اہمیت نہیں۔ ظاہر ہے کہ یہ خیال بڑا تباہ کن اور وبال انگیز ہے، تمھیں جان لینا چاہیے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم پر تمھاری بات ماننا لازم نہیں، بلکہ تم پر رسول اللہ کی بات ماننا فرض ہے۔ بالغرض رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا طرزِ عمل یہ ہو جائے کہ زیادہ تر تمھاری بات مانا کریں تو تم بڑی زحمتوں میں پڑ جاؤ گے، کیونکہ تمھارے پاس وہ عاقبت بینی اور دور اندیشی کہاں ہے جو فوجی اقدامات کو کامیاب ونتیجہ خیز بناتی ہے۔ کرنا چاہو گے فائدہ اور ہو جائے گا نقصان۔ چنانچہ ارشاد ہوا:

يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِنْ جَآءَكُمْ
فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ فَتَبَيَّنُوْٓا اَنْ تُصِيْبُوْا
قَوْمًۢا بِجَهَالَةٍ فَتُصْبِحُوْا عَلٰى مَا
فَعَلْتُمْ نٰدِمِيْنَ۔ (الحجرات 49:6)

”اے اہل ایمان، اگر تمھارے پاس
کوئی بد عمل شخص (کسی گروہ کے خلاف)
کوئی اہم خبر لائے تو تحقیق کر لو (کہ وہ
صحیح ہے یا غلط، بدونِ تحقیق اسے باور کر

کے کوئی اقدام نہ کرو) ایسا نہ ہو کہ نادانی
کی وجہ سے تم حملہ کرکے کسی گروہ کو
نقصان پہنچا دو (اور جو خبر تمھیں ملی ہے
فی الواقع غلط ہو جب تمھیں اصلیت
معلوم ہو) تو پچھتانے والے ہو جاؤ اس پر
جو تم نے کیا۔"

فاسق کے معنی کھلم کھلا اللہ کی نافرمانی کرنے والا۔ ہر کافر جس کا کفر معلوم ہو فاسق ہے، مگر ہر فاسق کافر نہیں ہوتا۔ چونکہ فاسق آدمی راست گوئی کا پابند اور حلال و حرام کی حدود کو ملحوظ رکھنے والا نہیں ہوتا، اس لیے اس کی دی ہوئی خبر کے متعلق دل میں دھکڑ پکڑ رہتی ہے۔ ممکن ہے، اس نے صحیح کہا ہو، ممکن ہے غلط کہا ہو۔ ہو سکتا ہے کہ کچھ جھوٹ اور کچھ سچ بولا ہو۔ اور سچا آدمی کوئی خبر دے تو اس پر سننے والوں کو اطمینان حاصل ہوتا ہے، لہٰذا اس کی دی ہوئی خبر کی تحقیق کی ضرورت نہیں۔ اسی آیت کی رو سے تمام اہل علم اس کے قائل ہیں کہ کسی سنی ہوئی خبر کے مقبول ہونے کی ایک اہم شرط یہ ہے کہ اس کے راوی راست گو (صادق القول) نیک (صالح العمل) مسلمان ہوں۔

واضح رہے کہ 'اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ' کا یہ مطلب نہیں ہے کہ فی الواقع ایسا ہوا تھا کہ کسی فاسق کی لائی ہوئی خبر کی وجہ سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور مسلمانوں نے کسی قبیلہ پر فوج کشی کا ارادہ کر لیا تھا اور بعد میں ثابت ہوا کہ وہ خبر غلط تھی اور اس پر یہ آیت نازل ہوئی تھی۔ اگر ایسا ہوا ہوتا تو 'اِنْ' کے بجاے 'اِذَا' ہوتا، مگر بعض دروغ باف راویوں نے اس آیت کے متعلق ایک شانِ نزول گھڑ کر لوگوں میں پھیلا دیا۔ وہ روایت اُن لوگوں تک پہنچ گئی جو قرآن کے عالم و مفسر سمجھے جاتے تھے اور جن کا مذاق آیات کے معانی و مطالب میں غور و تدبر کرنا نہیں تھا، بلکہ ہر آیت کے متعلق شانِ نزول لکھنا اور اسے لوگوں میں بے سوچے سمجھے بیان کرکے اپنے علمی تبحر کا سکہ جمانا تھا۔ پھر جب تفسیر میں کتابیں لکھی جانے لگیں تو ان کتابوں میں دیگر صدہا جھوٹی روایات کی طرح یہ روایات بھی درج کر دی گئی۔ اہل علم و تحقیق اس جھوٹی روایت کی تردید کر چکے ہیں، مگر افسوس کہ مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے اس پر اعتماد کرکے "تفہیم القرآن" میں اس انداز سے یہ جھوٹی کہانی ثبت کر دی ہے کہ ناظرین اسے قطعاً صحیح باور کر لیں۔ مولانا موصوف نے لکھا ہے:

”اکثر مفسرین کا بیان ہے کہ یہ آیت ولید بن عقبہ بن ابی معیط کے بارے میں نازل ہوئی ہے۔ اس کا قصہ یہ ہے کہ قبیلہ بنی المصطلق جب مسلمان ہو گیا تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ولید بن عقبہ کو بھیجا تاکہ ان لوگوں سے زکوٰۃ وصول کر لائیں۔ یہ ان کے علاقہ میں پہنچے تو کسی وجہ سے ڈر گئے اور اہل قبیلہ سے ملے بغیر واپس جا کر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے شکایت کر دی کہ انھوں نے زکوٰۃ دینے سے انکار کر دیا ہے اور وہ مجھے قتل کرنا چاہتے تھے۔ حضور یہ خبر سن کر سخت ناراض ہوئے اور آپ نے ارادہ کیا کہ ان لوگوں کی سرکوبی کے لیے ایک دستہ روانہ کریں۔ بعض روایات میں آیا ہے کہ آپ نے وہ دستہ روانہ کر دیا تھا اور بعض میں یہ بیان ہوا ہے کہ آپ روانہ کرنے والے تھے۔ بہر حال اس بات پر سب متفق ہیں کہ بنی المصطلق کے سردار حارث بن ضرار ام المومنین حضرت جویریہ کے والد اس دوران میں خود ایک وفد لے کر حضور کی خدمت میں پہنچ گئے اور عرض کیا کہ خدا کی قسم: ہم نے تو ولید کو دیکھا تک نہیں کجا کہ زکوٰۃ سے ہمیں انکار ہو، ہمیں زکوٰۃ سے ہر گز انکار نہیں ہے۔ اس پر یہ آیت نازل ہوئی۔ تھوڑے سے لفظی اختلاف کے ساتھ اس قصہ کو امام احمد، ابن ابی حاتم طبرانی اور ابن جریر نے حضرات عبد اللہ بن عباس، حارث بن ضرار، مجاہد، قتادہ، عبد الرحمٰن بن ابی لیلی، یزید بن رومان، ضحاک اور مقاتل بن حیان سے نقل کیا ہے۔ حضرت ام سلمہ کی روایت میں یہ پورا قصہ بیان تو اسی طرح ہوا ہے مگر اس میں ولید کے نام کی تصریح نہیں ہے۔“(تفہیم القرآن 5 / 73)

میں کہتا ہوں: اولاً ناظرین ولید بن عقبہ سے جس پر ماضی کے ظالموں کی طرح زمانۂ حال کے علم بردارِ تحریک اسلامی مولانا ابو الاعلیٰ مودودی نے بھی ناحق ظلم کیا ہے، متعارف ہو جائیں۔

ولید بن عقبہ کو امیر المومنین حضرت عثمان بن عفان رضی اللہ عنہ نے کوفہ کا حاکم مقرر کیا۔ پانچ سال تک وہ اس منصب پر رہے۔ ولید حضرت عثمان کے اخیافی، یعنی ماں شریک بھائی تھے، ان کی اور حضرت عثمان کی والدہ اَرْوٰی بنت کُرَیْز ہیں۔ اَرْوٰی حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی حقیقی پھوپھی بَیْضَاء بنت عبد المطلب کی بیٹی تھیں۔ اَرْوٰی کا پہلا نکاح عَفَّان سے ہوا تھا، ان سے حضرت عثمان پیدا ہوئے۔ عفان کے بعد عُقبہ بن ابی معیط سے نکاح ہوا۔ اس سے ولید پیدا ہوئے۔ عقبہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم کا سخت دشمن تھا۔ خبیث جنگ بدر میں گرفتار ہوا اور قتل کیا گیا۔ اس وقت ولید پنج سالہ بچہ تھا۔ 8ھ میں فتح مکہ کے موقع پر تقریباً گیارہ سالہ نابالغ لڑکا تھا۔ خود ولید بن عقبہ سے

مروی ہے کہ فتح مکہ کے موقع پر ولید اور چند اور بچے خدمت نبوی میں حاضر کیے گئے۔ حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے ولید کے علاوہ سب بچوں کے سروں پر دست برکت پھیرا۔ ولید اس سعادت سے اس لیے محروم رہا کہ اس کے سر پر خَلُوق نامی خوشبو لگی ہوئی تھی (مسند احمد 4/ 32) اور یہ اس لیے کہ حضور صلی اللہ علیہ وسلم مرد کے لیے خَلُوق کی خوشبو پسند نہیں فرماتے تھے، خواہ نابالغ لڑکا ہی ہو۔ اور عرب کی عورتیں اکثر بچوں کے سروں پر خلوق لگایا کرتی تھی، آپ نے اس کی ممانعت فرمائی ہے۔ حضرت عثمان کی شہادت کے بعد ولید نے مقامِ رَقَّد میں سکونت اختیار کرلی تھی، اسی لیے اسی مقام کے لوگوں میں تسلسل کے ساتھ ولید کی بیان کردہ یہ حدیث اگلوں سے پچھلوں کو پہنچتی ہوئی امام احمد وغیرہ تک پہنچی ہے اور اس کے رُوات سب عدل و ثقہ ہیں۔ اور بنی مصطلق رمضان یا شوال 6ھ میں مسلمان ہوئے ہیں۔ ان کے پاس صدقات وصول کرنے کے لیے حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے 7ھ میں ہی کسی کو بھیجا ہو گا۔ تو کوئی بتائے تو سہی وہ شخص ولید بن عقبہ کیسے ہو سکتا ہے کہ وفات نبوی تک بھی ولید بالغ نہیں ہوا تھا۔

ولید حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ کے زمانہ میں سن رشد کو پہنچا تھا اور عنفوانِ شباب سے ہی دین کی بہترین خدمات ادا کرنے کے مواقع اسے نصیب ہوتے رہے تھے۔ چنانچہ جب سیف اللہ حضرت خالد بن ولید رضی اللہ عنہ ایرانیوں کے مجوسیوں سے نبرد آزما تھے تو حضرت ابو بکر ان کے پاس ولید کے ذریعے سے ہی خصوصی ہدایات بھیجتے تھے۔ (تاریخ طبری 4/ 7) پھر حضرت عیاض بن غنم فہری کی کمک کے لیے بھی ولید کو بھیجا۔ (تاریخ طبری 4/ 22) اور 13ھ میں حضرت ابو بکر رضی اللہ عنہ نے جب فتح شام کا قصد فرمایا تو فاتح مصر عمرو بن عاص رضی اللہ عنہ کے ساتھ ولید بن عقبہ کو بھی سالارئ لشکر کا منصب عطا فرمایا، یعنی حضرت ابو بکر کے یہاں احترام و اعتماد اور اعزاز میں یہ نوجوان قریش کے مشہور و تجربہ کار سیاست دان اور سرد و گرم چشیدہ مدبر انسان کے دوش بدوش تھا۔ عمرو بن العاص تو فلسطین کی طرف پرچم اسلام لہراتے ہوئے گئے اور ولید بن عقبہ فیروزمندی کا علم اٹھائے ہوئے شرق اردن کی طرف راہی ہوئے (تاریخ طبری 4/ 30-29)۔

پھر 15ھ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ولید کو علاقہ بنی تغلب اور جزیرہ کا گورنر بنایا (تاریخ طبری 4/ 155)۔ یہاں ان کا خاص مقصد ان مجاہدین کی پشت پناہی کرنا اور ان کے عقب کو محفوظ رکھنا تھا جو شام کے شمالی حصہ میں دادِ شجاعت دے رہے تھے۔ اس وقت قبائل

ربیعہ و تنوخ سب کے سب ولید کے تحت تھے اور چونکہ ہنوز اس علاقہ میں عیسائی مذہب رکھنے والے عرب (عربِ متنصِرہ) کافی تھے، اس لیے اسلام کے اس جاں باز خادم نے وعظ و نصیحت اور تفہیم و تبلیغ کے ذریعے سے ان میں روح اسلام پھونکنی شروع کر دی۔ اس کوشش کے خاطر خواہ مفید نتائج نکلے۔ اب ذرا سوچیے تو سہی اگر 'اِنْ جَآءَكُمْ فَاسِقٌۢ بِنَبَاٍ' فرما کر اللہ نے ولید کو فاسق ٹھہرا دیا ہوتا تو کیا ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہ ولید کو ان مناصب سے نواز سکتے تھے۔ پھر حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے ولید کو اپنے عہد میں کوفہ کی حکومت سونپی وہ پانچ سال تک وہاں کے حاکم رہے اور عدل و رافت کا جو نہج وہاں ولید نے اختیار کیا تھا، اس کا اندازہ اس سے ہو سکتا ہے کہ ان کے قصرِ امارت پر دروازہ نہ تھا تاکہ ہر شخص جب چاہے ان کے پاس آ سکے۔ حافظ ابن کثیر نے لکھا ہے: 'فلما قدمها أقبل عليه أهلها فأقام بها خمس سنين وليس على داره باب وكان فيه رفق برعيه' (البدایہ والنہایہ 7/ 151)۔ مگر ولید باایں ہمہ بڑا عیب دار و خطاوار تھا۔ اس میں وہ عظیم الشان عیب تھا جو خواہ اللہ اور اس کے رسول کے نزدیک عیب نہ ہو، لیکن اس امت کے اندھے بہرے لوگوں کے نزدیک نہ اس سے بڑھ کر کوئی عیب ہے، نہ اس سے بڑا کوئی جرم۔ آپ جانتے ہیں کیا ہے وہ عیب و خطا، وہ یہ ہے کہ بے چارہ ولید اموی اور حضرت عثمان کا عزیز قریب تھا۔ محض اس "جرمِ و عیب" کی وجہ سے اور تو اور مولانا سید ابو الاعلیٰ مودودی نے بھی اسے نہیں بخشا۔

اب مودودی صاحب کے ثبت کیے ہوئے افسانہ کی روایات کا حال سنیے۔ یہ روایات مجاہد یا قتادہ یا ابن ابی لیلیٰ یا یزید بن رومان تک پہنچی ہیں۔ انھی لوگوں نے یہ قصہ نقل کیا ہے، مگر ان سب کو کسی سے معلوم ہوا تھا؟ اس کا کوئی سراغ نہیں ملتا۔ ان لوگوں میں سے کسی نے ولید کو بھی نہیں دیکھا۔ آں حضور صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات اور ان لوگوں کے درمیان تقریباً سو برس کی طویل مدت ہے۔ ایک صدی قبل کا قصہ آخر ان لوگوں کو کس سے معلوم ہوا تھا؟ اس سوال کا جواب مل نہیں سکتا تو کسی معقول شخص کو ان روایات پر اعتماد کر کے اس شخص کو مطعون کرنا جائز نہیں ہے جس کی آنکھوں نے جمالِ نبوی دیکھا تھا، جس پر ابو بکر و عمر رضی اللہ عنہما نے اعتماد کیا تھا، جس نے کفار کے مقابلہ پر بہت سے معرکوں میں دادِ شجاعت دی اور ایک مدت تک خلقِ خدا میں عدل گستری کی تھی۔

[باقی]

نبیل اشفاق

دعوت میں احترام رائے کی اہمیت

کچھ عرصہ قبل مجھے ایک کمرشل پراپرٹی کی فنانسنگ کے سلسلے میں ایک فنانشل ایڈوائزر سے ملنے کا اتفاق ہوا۔ وہ صاحب کافی مصروف شخص تھے، لہٰذا ان سے صرف آدھ گھنٹے کی میٹنگ کا وقت طے ہوا۔ وہ ٹھیک اپنے وقت پر میرے لندن آفس میں تشریف لائے اور مجھے مختلف فنانسنگ پراڈکٹس کے بارے میں تفصیل فراہم کرتے رہے۔ دوران گفتگو میں نے ان سے جاننا چاہا کہ کیا وہ اسلامک فنڈنگ میں بھی ڈیل کرتے ہیں، میرے سوال پوچھنے پر وہ کچھ دیر کے لیے چونکے اور چند لمحوں کے توقف کے بعد بولے کہ جی ہاں، میں اسلامک فنڈنگ حاصل کرنے میں بھی آپ کی مدد کر سکتا ہوں۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ وہ ایک ایکس مسلم ہیں، یعنی میری زبان میں ایک مرتد، انھیں معلوم تھا کہ میں مسلمان ہوں، لہٰذا اپنے آپ کو مرتد بتانے کے بعد انھوں نے اپنی نشست سے اٹھتے ہوئے فرمایا کہ اب آپ تو میرے ساتھ ڈیل نہیں کریں گے، لہٰذا مجھے اجازت دیں۔ انھوں نے مزید فرمایا کہ یہ لندن ہے، لہٰذا آپ میرا یہاں کچھ بگاڑ بھی نہیں سکتے۔ میں نے ان کی بات سننے کے بعد ان سے بیٹھنے کے لیے کہا اور ساتھ ہی سوال کر دیا کہ وہ آخر کیوں میرے بارے میں یہ رائے رکھتے ہیں کہ میں ان کے ماضی کو جاننے کے بعد ان سے ڈیل نہیں کروں گا۔ انھوں نے جواب دیا کہ جب سے انھوں نے اسلام کو خیر آباد کہا ہے، تب سے ان کے والدین اور رشتہ داروں نے ان سے قطع تعلق کر لیا ہے، مزید یہ کہ وہ جانتے تھے کہ پاکستان کے لوگ مرتد کے بارے میں کیا رائے رکھتے ہیں، لہٰذا اسی لیے انھوں نے وہاں سے اٹھنے کو ترجیح

دی۔ میں نے ان کو تسلی دی کہ میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں اور میں ضرور ان سے بزنس ڈیل کروں گا۔ میں نے اسی اثنا میں ان سے سوال کر ڈالا کہ اگر وہ مناسب سمجھیں تو کیا وہ مجھے اپنے اسلام چھوڑنے کی وجہ بتانا پسند کریں گے۔ انھوں نے جواب دیا کہ میں نے اسلام کو سچے خدا کے لیے چھوڑا ہے۔ میں نے پوچھا کہ ان کو سچا خدا کہاں ملا؟ انھوں نے فرمایا کہ انھیں سچا خدا کرسچینیٹی میں ملا اور وہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام اور بائیبل پر ایمان لے آئے ہیں۔ انھوں نے مزید کہا کہ انھوں نے کبھی شراب کو ہاتھ نہیں لگایا، کبھی کسی کو دھوکا نہیں دیا اور وہ اپنی زندگی اپنے خدا کے بتائے ہوئے طریقے کے مطابق جیتے ہیں، لیکن اس کے باوجود ان کے رشتہ دار ان کو جہنمی کہتے ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ اگر ان کے دین اسلام چھوڑنے کی وجہ واقعی سچے خدا کی تلاش ہے اور وہ خدا کے بتائے ہوئے طریقے پر زندگی گزار رہے ہیں اور جانتے بوجھتے حق کا انکار نہیں کر رہے تو میری طالب علمانہ رائے میں وہ جنت کے حق دار قرار پائیں گے۔ میرا جواب سن کر وہ بہت ہی حیران ہوئے اور کہنے لگے کہ کیا آپ واقعی مسلمان ہیں؟ میں نے ان کو اپنے مسلمان ہونے کی تسلی دلائی اور انھیں بتایا کہ میری ان کے بارے میں رائے دین کی روشنی کے عین مطابق ہے، میرا جواب ان کے تجسس میں مزید اضافے کا باعث بنا۔ انھوں نے مزید سوال کیا کہ آپ کا میرے بارے میں اتنا اچھا گمان رکھنے کی آخر وجہ کیا ہے، جب کہ میرے اپنے خاندان والوں نے تو مجھے دھتکار دیا ہے۔ میں نے انھیں بتایا کہ میری رائے میں وہ ایک پیدایشی ایرانی مسلمان ہیں اور دین اسلام کو انھوں نے کبھی جانا ہی نہیں، اگر جانتے تو یقیناً انھیں اندازہ ہوتا کہ جس حق کو وہ اب دل و جان سے قبول کر بیٹھے ہیں، قرآن مجید اسی دین کی آخری کتاب ہے۔ ہماری گفتگو خوشگوار ماحول میں مزید چند گھنٹوں کے لیے جاری رہی اور ہم علمی تبادلہ خیال کرتے رہے۔ وہ جانے سے پہلے اٹھے اور مجھے گلے لگانے کی خواہش ظاہر کی، میں نے ان کی خواہش کا احترام کرتے ہوئے انھیں زور سے گلے لگایا۔ اسی دوران میں ان کی آنکھیں کچھ نم ہو گئیں۔

وہ آج بھی میرے ساتھ رابطے میں ہیں، ہم کبھی کبھار مذہب کو بھی موضوع گفتگو بنا لیتے ہیں اور مجھے جب بھی موقع ملتا ہے، میں انھیں دین اسلام کے بارے میں کچھ نہ کچھ آگاہی دیتا رہتا ہوں۔ مجھے ان کے بارے میں اچھا گمان ہے کہ جس لمحے وہ دل کی اتھاہ گہرائیوں سے جان پائیں کہ دین اسلام حق ہے تو وہ ضرور اس حق کے سامنے سر تسلیم خم کریں گے، جیسا کہ انھوں نے سچے

خدا کی تلاش میں کرسچینیٹی کو اپنایا۔ باقی میں نے کبھی ان پر دین اسلام قبول کرنے کے لیے زور زبردستی نہیں کی اور زور زبردستی بھی کاہے کی؟ میری رائے میں تو وہ پہلے سے ہی مسلمان ہیں، بھلے اپنے آپ کو دنیاوی لحاظ سے کرسچن سمجھتا رہے۔

حرف و آہنگ نہ ہوں سوزِ دروں سے خالی
ہر رگِ ساز میں اب خونِ جگر تازہ کریں

محمد غطریف شہباز ندوی

الإيمان بالله

للاستاذ جاويد أحمد الغامدي

الإنسان مخلوق. تبدأ قضية الدين بإدراك هذه الحقيقة. إنها حقيقة وجودية و يمكننا ملاحظتها بأعيننا وقتما نريد. لذلك نحن نعرف من أية عناصر غير حية يتم إنشاء كيان الإنسان. وأين وإلى أى مصنع تذهب تلك العناصر من خلال نظامنا الغذائى؟ وكما نحن نعلم أنه لا توجد بذرة إنسانية فيها، ولا يوجد أى شىء يحول المادةَ إلى حياة والحياةَ إلى وعى وشعور.

ولكن عندما يصل الغذاء نفسه إلى نقطة معينة، يتم تحويله إلى مادة منوية تحتوى على النطف المنوية القادرة على أن تصبح إنسانا. وتوجد الجراثيم المنوية بالملايين والملايين فى هذه المادة المنوية، والتى تخرج من ذكر واحد فى مرة واحدة. وكل واحد منها لديه القدرة على لقاء وتلقيح بويضة المرأة، والتى تتشكل بنفس الطريقة فى مصنع آخر، وتصبح إنسانا كاملا.

ويمكننا أن نرى أنه عندما تلتقى هذه الجرثومة بالبويضة، فإن الشىء الذى يظهر إلى حيزالوجود فى البداية يكون صغيراً جدا بحيث لا يمكن رؤيته بدون مجهر، ولكن ثم

يتحول نفس الشیء المحتقر فی تسعة أشهر وبضعة أيام بدأً من قطرة ماء، فی مضغة تتحول فی جلطة، ثم فی العظام المركبة عليها اللحم،ويصبح شيئًا آخر فی رحم الام ويخرج إلی العالم الكون. حتی يتمكن من إظهار عجائب المعرفة والتفكير والفكر والصناعة،والتی يمكن رؤيتها ومشاهدتها فی كل مكان فی العالم فی هذا الوقت.

نری هذا المخلوق ونصطر من خلال بنية وعينا أن نبحث عن خالقه. ليس لانه يجب أن يكون هناك خالق لكل الاشياء، بل لانه يجب أن يكون هناك خالق لكل مخلوق. إن فعل الخلق هو الذی يجبرنا علی البحث والتفقد عنه. لقد وُلدنا مع هذا القلق وحس الفحص، لذلك لا يمكننا أبدًا أن نتفق علی التخلی عن البحث عن فاعل لفعالية وعن مؤثر لكل تأثير.

انظروا إلی كل أساطين الفلسفة والعلم والتصوف واحدا تلو الآخر،لم يتمكن أحد من التخلی عنها. لذلك،فإن تاريخ المعرفة كله هو تاريخ الاعتراف بحقيقة أن كل مخلوق له خالق،وبما أن الإنسان مخلوق،لذلك يجب أن يكون له أيضا خالق.

وليس هذا فقط، ولكننا نعلم أن عمل الخلقة الذی شهدناه مقصود وإرادی،وفی كل جزء منه ظهرت قوة هائلة ومعرفة وحكمة لا مثيل لها. وكما أننا لا نستطيع أن ننكر الخلق، لا يمكننا أن ننكر طبيعة العمل هذه. لان طبيعة الفعل هذه هی حقيقة وجودية تماما كما أن وظيفة الخلق هی أيضا حقيقة وجودية.

وكما نلاحظ العمل، نلاحظ هذه الحقيقة أيضا، لذلك نحن ملزمون بالاعتراف فی الوقت نفسه بأن خالق الإنسان هو صاحب الإرادة، وقوته غير محدودة، وهو عالم وحكيم.

فقد يجیء عقل الإنسان به ويحضره إلی هنا. فهو فی هذه الرحلة لا يحتاج إلی أی توجيه من الخارج. إن قدرة المعرفة والفهم التی منحها الإنسان عند ولادته كافية لإرشاده فی هذه الرحلة. ولكن أبعد من ذلك، فإن السؤال أن من هو ذلك الخالق؟ لا يمكن للعقل البشری أن يجيب علی هذا بنفس اليقين والقطعية الحتمية.

وهكذا، فإن عقله عادة ما ينظر إلی الإجابتين اللتين تم تقديمهما عبرَ تاريخ البشرية ويختار بينهما أو يظل يتردد فی صراع بينهما.

الجواب الاول هو أن الكون الذی یفتح الإنسان فی حضنه عین الوعی والشعور هو خالقه. هذا هو جواب الإلحاد.

ویتم تقریر هذا الرد بشکل عام بطریقة تجعل الکون لدیه وعیه الخاص، بحیث تکون تلك القوة المبدعة أیضًا بداخله، والتی هی خلاقة من حیث واقعها. لا یوجد شیء خارجه، ولکن التمییز بین الداخل والخارج موجود أیضًا بداخله. وکل جزء منه موجود بنفسه فی داخله وأیضا فی خارجه. إنه مصنع الاسباب والعلل، لکن السبب النهائی فی مجمله هو نفسه.

وهذه الإجابة مجرد ادعاء.

أولاً، لانه لم یتم رصد أی دلیل فی مشاهدتنا علی الوعی الذاتی للکون الذی تدعیه هذه الإجابة. ونحن نعلم أن حقیقة الکون هی المادة، والمادة خالیة من القصد، کما أنها خالیة من العلم والعقل. وهذه الاشیاء، إذا وجدت فی أی مکان، فهی موجودة فی نفس المخلوق، الذی أُدعی فیه أن هذا الکون هو خالقه، ولیس هذا فحسب، فهذه القوة أیضًا فی مستویً ما، إذا وجدت فی أی مکان فهی فی نفس المخلوق، وبدونها یصبح الکل من المعرفة والعقل والإرادة بلا معنیً.

ثانیًا، لان ظهور قوة الکون، الذی اعتبر خلقا، هو مجرد ظهور لخصائص الشئ الکائن وفعالیته وتأثیره. ویمکننا أن نری هذا النوع من الظهور فی کل جزء من الآلات الاوتوماتیکیة التی اخترعها الإنسان، وفی شکل الذکاء الاصطناعی، الذی یفاجئ کماله المذهل الجمیع الآن.

ثالثًا، لان مجملها إن وُجد، فهو مجموع نفس التأثیرات والخصائص التی تخلق علاقات السبب والنتیجة وعلاقة العلة والمعلول فیه. ولا علاقة له بفعل الخلق، الذی یتطلب قوة المعرفة والعقل والنیة والعمل فی کل مرحلة. فهذا عالم الاسباب والعلل ودنیا المناهج والقوانین. ولیس لها مکانة أکبر من ذلك.

من هو خالق الإنسان؟ الجواب الثانی علی هذا السؤال هو الذی قدمه أولئك الذین یقدمون أنفسهم کأنبیاء. وکانت قد أعطیت هذه الإجابة للإنسان مع بدایة خلقه. فکما

كان الإنسان الاول أولَ إنسان، كذلك كان كذلك النبىَ الاول. وتتلخص هذه الإجابة فى أن خالق الإنسان هو الذات الحكيم خارج هذا الكون. بدأ خلق الإنسان من بطن الارض. فإن نفس عناصر التربة التى تدخل إلينا على شكل طعام وتبدأ هذه العملية بالتحول إلى ملخص للماء المهين (النطفة المنوية)، التى يصنع منها البشر، قد مرت بنفس العملية داخل الطين اللازب فى ذاك الوقت، حتى اكتمل الخلق، وجف نفس الملاط من الاعلى وأصبح الطين صلصالاً كالفخار، وبسبب الهدم والكسر فيه ظهر كائن حى، والتى ينبغى أن تسمى وجود للإنسان. ثم بدأ نفس الفعل الذى حدث داخل الارض يحدث داخل هذا الكائن الغير المهذب و دون علم وفهم، وبعد ذلك تم صقله وتهذيبه وتسويته بكل طريقة، حتى تمكن من إعطائه شخصية الإنسان. لذلك تم منحه إياها مع ضربة خفية ونفخ فيه من روحه: كما قال:

بَدَاَ خَلْقَ الْاِنْسَانِ مِنْ طِيْنٍ، ثُمَّ جَعَلَ نَسْلَهٗ مِنْ سُلٰلَةٍ مِّنْ مَّآءٍ مَّهِيْنٍ، ثُمَّ سَوّٰىهُ وَنَفَخَ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِهٖ، وَجَعَلَ لَكُمُ السَّمْعَ وَالْاَبْصَارَ وَالْاَفْـِٕدَةَ قَلِيْلًا مَّا تَشْكُرُوْنَ. (السجدة ٣٢: ٧-٩)

والمصدر الذى رُد منه هذا الجواب آخر مرة هو هذا القرآن الذى نقلت آياته أعلاه. ويزعم النبى الذى قدمه أنه كلام الخالق الذى نزل عليه، وكما نزل قرأه على الناس بنفس الطريقة ولم يبدل فيه حرفا ولا مقطعا، ولن يجرؤ على ذلك أحد غيره إلى يوم القيامة.

وهذا الادعاء مذكور فى القرآن نفسه، ومعه تم طرح معيار واضح جدًا، يمكننا على أساسه أن نقرر ما إذا كان القرآن حقًا كلام الخالق أم افتراء إنسان نسبه إلى الخالق؟

وما هو ذاك المعيار؟ ويمكننا أن نعرض ذلك فى النقاط الثلاث التالية:

الاول: أن المعرفة التى يبدعها الإنسان لفظاً ومعنى، تكون معرفة ثابتة بعد المرور بمراحل عديدة من التجربة والخطأ. ففى اليوم الاول، ليس هو سقراط ولا أفلاطون، ولا غالب وشكسبير، ولا نيوتن وآينشتاين وهلم جراً. فإنه يتعلم ويفهم ويخطئ فى كل مرحلة من مراحل التعلم والفهم أخطاءً ويصححها أيضاً. نراه يأخذ المعارف من المتقدمين سنوات، ويمارسها، ويصقلها، ويتقدم فيها خطوة خطوة، حتى تصدر منه جوهرة العلم

ورائعة الادب. هذا هو قدر الإنسان وقد ولد به. وفى تاريخ العلم والادب كله، لم نشهد أى استثناء لهذا أبداً، ولا يمكن تصور مثل هذا الاستثناء على الإطلاق مستقبلاً.

لكن القرآن له استثناء من ذلك. فإن الشخص الذى قدمه كان يراه شعبه ليل نهار لمدة أربعين عامًا فى قرية صغيرة مكونة من بضع مئات من المنازل. لقد مرت أيامه ولياليه أمام أعينهم، لكنهم لم يروه قط يمر بشائبة من مراحل التجربة والخطأ تلك لمثل هذه المعرفة والكلمات التى هى مخصصة لكل إنسان، ولذلك، فإن الحقيقة أنهم لا يكادون يصدقون أن هذا الرجل الصادق والامين من قريتهم يمكن له أن يكون خالقَ مثل هذه المعرفة ومبدعَ مثل هذه الكلمات العظيمة. فكانوا يضطرون أن يقولوا متضايقين أن كل هذا قد أملى عليه عجمى متعلم. وقد نبههم القرآن ولفت أنظارهم إلى ذلك فقال:

قُلْ لَّوْ شَآءَ اللّٰهُ مَا تَلَوْتُهٗ عَلَيْكُمْ وَلَآ اَدْرٰىكُمْ بِهٖ، فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ، اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ؟ فَمَنْ اَظْلَمُ مِمَّنِ افْتَرٰى عَلَى اللّٰهِ كَذِبًا اَوْ كَذَّبَ بِاٰيٰتِهٖ، اِنَّهٗ لَا يُفْلِحُ الْمُجْرِمُوْنَ.

(يونس ١٠: ١٦-١٧)

وكان المقصود أن يخاطبهم النبى قائلاً أيها الاغبياء! متى رأيتمونى أهتم بهذه المناقشات والمباحث أو أعبر عن بعض الافكار والآراء عنها أو أتدرب على تحريرها أو أكتسب أى علم وفن يتعلق بها والتى يتم تناولها تباعا فى سور القرآن الآن؟ وقد أقمت بين أظهركم طوال الاربعين سنة فمتى شعرتم بشىء فى كلامى وحركاتى واندفاعاتى، مما يمكن تسميته مقدمةً للدعوة التى أتوجه بها إليكم فى هذا الوقت؟

ما أقوله اليوم، هل وجدتم أى علامات تطور له فى حياتى؟ ألا تعلمون أن دماغ الإنسان لا يستطيع إنتاج أى شىء فى أية مرحلة من عمره، والذى لا تظهر عليه علامات التطور فى المراحل المبكرة؟ وأنتم تقولون اليوم إننى أكذب على الله. وقبل هذا هل سبق لكم أن رأيتم أية شائبة لاى كذب أو خداع أو تزوير أو دجل فى شخصيتى؟ حتى اليوم كنتم تعتبروننى صادقًا أمينا وجديرًا بالثقة.

والآن كيف تقولون إن نفس الصادق والامين أصبح كذابا مفتريا وضالا بين عشية وضحاها؟ ياعباد الله! لماذا لا تعقلون ولا تتصرفون بحكمة؟

والثانى هو أن المعرفة الإنسانية لا يمكن أن تكون خالية من التناقضات. فإن حكاية النحت والعبادة والكسر، الذى يبدأ الإنسان كتابته منذ اليوم الاول تستمر حتى النهاية. وهذا أيضًا إذا فكرت فيه، علمتَ أنه نتيجة لنفس التجربة والخطأ الذى ذكرناه لاحقًا. وليس هذا فحسب، فإذا اتخذت معرفته هذه يوما ما شكل الادب، فسوف يحدث فيه نفس الوضع.

إذا نظرت إلى أعماله بعناية، يبدو لك كل من القصيدة والبلاغة والمعنى مختلفا متفاوتاً. فيكون كلامه معجزة للجمال فى بعض الاماكن، وفى بعض الاماكن يظهر فى درجة سافلة بكثير وحتى فى بعضها الآخر مهملاً. لذلك، إنها حقيقة أنه لم يكن هناك أبدا إنسان فى العالم يستمر فى إلقاء الخطب حول مواضيع متنوعة وفى مواقف مختلفة تبلغ إلى حد الإعجاز من حيث البلاغة ورفعة الكلام، وعندما يتم جمع وشمل هذه الخطب من البداية إلى النهاية أن تأخذ شكلَ مجموعة متناغمة ومتلائمة ومنسجمة من الكلام، حيث لا يوجد صراع الافكار، ولا توجد لمحة عن الاحوال التى تنشأ فى قلب المتحدث والمتكلم وعقله، ولا يمكن رؤية أى علامات تغير فى الرأى ووجهة النظر فى أى مكان فيه.

ولكن للقرآن هناك استثناء من هذه الكلية أيضا: فقد قال تعالى:

أَفَلَا يَتَدَبَّرُوْنَ الْقُرْاٰنَ وَلَوْ كَانَ مِنْ عِنْدِ غَيْرِ اللّٰهِ لَوَجَدُوْا فِيْهِ اخْتِلَافًا كَثِيْرًا. (النساء ۴: ۸۲)

يقول الاستاذ الإمام:

”وكل مقولة للقرآن مستحكمة ومترابطة فى أصولها وفروعها إلى درجة لم تكن صيغ الرياضة وقوانين الاقليدس مستحكمة كاستحكامها. فإن العقائد التى جاء بها هى متناسقة ومترابطة بعضها من بعض، أن نفرق واحدة منها فتنشر السلسلة الكاملة لها. والعبادات والطاعات التى يأمر بها هى تنبثق من تلك العقائد كما تتفرع الاغصان من الجذع. والاعمال والاخلاق التى يلقنها القرآن تظهر من أصولها كما يظهر اللوازم الطبيعية الفطرية من الشىء. ونظام الحياة الذى يحدث من تعليمه الجماعى يبرز فى صورة بنيان مرصوص. كل لبنة من لبناتها ترتبط وتلتصق بعضها من بعض، أن لا يمكن تجزئتها من الاخرى إلا بإحداث خلاء فى البنيان كله.“ (تدبر قرآن ۲/ ۳۴۷)

ثالثًا، إن علم الإنسان لا يكون صحيحا مطلقا أبدا. هناك دائما مزيج من الحقيقة والباطل فيه. ولذلك فهو لا يغادر الدنيا حتى تظهر أخطاء علمه ومعلوماته واستدلالاته وظنونه. وهذا هو مصير كل من سقراط وأفلاطون ونيوتن وأينشتاين. ولا يمكن لاحد الهروب منه. ولم يُر أحد مستثنىً من ذلك في أي مكان وفي أي عصر في تاريخ العلم والادب كله. لكن القرآن له استثناء مذهل في هذا الشأن أيضًا.

وكتاب الله هذا متواجد عندنا في يومنا هذا، مر عليه خمسة عشر قرنًا على أقل حد. وتحديه باق حتى اليوم، ولكن لم يكن من الممكن لاحد من أعظم الفلاسفة والحكماء والعلماء أن يثبت خطأً من كلامه أو بطلاناً في تعاليمه.

والدنيا في أثناء هذه البرهة الطويلة قد تغيرت رأسًا على عقب، لكن لم يتم الكشف عن مثل هذه الحقيقة في هذه الرحلة بأكملها، ولكن في هذه الرحلة بأكملها لم يتم الكشف عن حقيقة تتعارض مع الحقائق التي قدمها القرآن، ولم تنكر أي معرفة المعرفةَ المذكورة في القرآن، ولم يتم أية خبرة وملاحظة، تثبت التوجيه الذي أعطاه القرآن للإنسان لاي غرض يهدفه باطلاً، وما يسميه حقاً لم يكن أبدا كاذبا، وما يسميه كاذبا لم يثبت صحته أبدا. وهذه حقائق لا تجحد عن القرآن كما قال تعالى:

وَاِنَّهٗ لَكِتٰبٌ عَزِيْزٌ، لَّا يَاْتِيْهِ الْبَاطِلُ مِنْۢ بَيْنِ يَدَيْهِ، وَلَا مِنْ خَلْفِهٖ، تَنْزِيْلٌ مِّنْ حَكِيْمٍ حَمِيْدٍ. (حمٓ السجدة ۴۱: ۴۱-۴۲)

هذا هو المعيار الذي بموجبه أخبر القرآن الإنسان، بعد إثبات صحته، أن الكون الذي تخطئون في اعتقاده أنه خالقكم، هو أيضًا مخلوق لمن هو خالقكم.

ألا ترون أن كل شيء لهذه الدنيا هو إظهار بارع ومؤشر عظيم على الخلق المبدع، وفي كل شيء له آية، ومعنوية عميقة، واهتمام كبير، وحكمة بالغة، ومنفعة كبيرة، ونظم عجيب، وترتيب تام، ورياضة لا نظير لها. لا توجيه لكل ذلك إلا أن هناك خالقًا كبيرًا وذاك الخالق هو الذي خلقكم.

وهو الذي جعل لكم الارض مهادا والجبال أوتاداً وخلقكم أزواجا وجعل نومكم ثباتاً وراحةً، والليل لباسا والنهار معاشاً وخلق فوقكم سبع سماوات شداداً وأضاء فيهن

سراجا مشتعلا. وهو الذى أنزل لكم المطر غزيراً فأنبت به خضرة وحبات وحدائق مدهامة غلبة. كما قال تعالى:

هُوَاللّٰهُ الَّذِىْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، عٰلِمُ الْغَيْبِ وَالشَّهَادَةِ، هُوَالرَّحْمٰنُ الرَّحِيْمُ، هُوَاللّٰهُ الَّذِىْ لَا اِلٰهَ اِلَّا هُوَ، اَلْمَلِكُ الْقُدُّوْسُ السَّلٰمُ الْمُؤْمِنُ الْمُهَيْمِنُ الْعَزِيْزُ الْجَبَّارُ الْمُتَكَبِّرُ، سُبْحٰنَ اللّٰهِ عَمَّا يُشْرِكُوْنَ. هُوَ اللّٰهُ الْخَالِقُ الْبَارِئُ الْمُصَوِّرُ، لَهُ الْاَسْمَآءُ الْحُسْنٰى، يُسَبِّحُ لَهٗ مَا فِى السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، وَهُوَالْعَزِيْزُ الْحَكِيْمُ. (الحشر ۵۹: ۲۲-۲۴)

وينص القرآن على أن الاعتراف بسيادة وربوبية هذا الخالق هو شىء تم غرسه فى طبيعة الإنسان منذ الازل. ويذكر أن هذا الامر قد حدث فى شكل عهد وميثاق. ويذكر القرآن هذا العهد كأمر واقعى ثابت.

لقد كان بعث الإنسان إلى هنا للامتحان والابتلاء، لذلك تم محو تلك الحادثة من ذاكرته، لكن واقعيته مطبوعة على صفحة قلبه وراسخة فى كامن عقله، لدرجة لا شىء يمكن أن يصرفه ويمحوه. ولذا، إذا لم يمنع شىء فى البيئة وتم تذكير الشخص بذاك العهد والميثاق، فإنه يقفز نحوه تماما كما يقفز الطفل نحو الام، على الرغم من أنه لم ير نفسه يخرج من رحم الام، ويقفز مع الاعتقاد كما لو كان يعرفها من قبل.

وإنه يشعر أن اعتراف الخالق واقراره هذا كان استجابة لحاجته إلى ضرورة طبيعية كانت موجودة فيه. وقد وجدها الآن، لذلك وجدت جميع متطلبات نفسيته مكانها معه. وينص القرآن أن هذه الشهادة لداخل للإنسان وباطنه قاطعة لدرجة أنه فيما يتعلق بسيادة الله وربوبيته، فإن الجميع مسؤولون أمام الله على أساس مجرد هذه الشهادة فقط. كما قال تعالى:

وَاِذْ اَخَذَ رَبُّكَ مِنْ بَنِىْ اٰدَمَ مِنْ ظُهُوْرِهِمْ ذُرِّيَّتَهُمْ، وَاَشْهَدَهُمْ عَلٰى اَنْفُسِهِمْ، اَلَسْتُ بِرَبِّكُمْ؟ قَالُوْا: بَلٰى، شَهِدْنَا اَنْ تَقُوْلُوْا يَوْمَ الْقِيٰمَةِ: اِنَّا كُنَّا عَنْ هٰذَا غٰفِلِيْنَ. اَوْ تَقُوْلُوْا اِنَّمَا اَشْرَكَ اٰبَآؤُنَا مِنْ قَبْلُ، وَكُنَّا ذُرِّيَّةً مِّنْ بَعْدِهِمْ، اَفَتُهْلِكُنَا بِمَا فَعَلَ الْمُبْطِلُوْنَ؟ وَكَذٰلِكَ نُفَصِّلُ الْاٰيٰتِ، وَلَعَلَّهُمْ يَرْجِعُوْنَ. (الاعراف ۷: ۱۷۲-۱۷۴)

وهذا الاعتراف هو روح هذا الكون. فعقل الإنسان راض عنه ويطمئن له وصدره يكون مطلعاً

للانواربه. فيصرخ قائلا: لاريب، إنه الله، بنوره تضئ هذه الارض والسماوات. وقال تعالى:

اَللّٰهُ نُوْرُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ، مَثَلُ نُوْرِهٖ كَمِشْكٰوةٍ فِيْهَا مِصْبَاحٌ، اَلْمِصْبَاحُ فِيْ زُجَاجَةٍ، اَلزُّجَاجَةُ كَاَنَّهَا كَوْكَبٌ دُرِّيٌّ، يُّوْقَدُ مِنْ شَجَرَةٍ مُّبٰرَكَةٍ زَيْتُوْنَةٍ، لَّا شَرْقِيَّةٍ وَّلَا غَرْبِيَّةٍ، يَّكَادُ زَيْتُهَا يُضِيْٓءُ وَلَوْ لَمْ تَمْسَسْهُ نَارٌ، نُوْرٌ عَلٰى نُوْرٍ، يَهْدِى اللّٰهُ لِنُوْرِهٖ مَنْ يَّشَآءُ، وَيَضْرِبُ اللّٰهُ الْاَمْثَالَ لِلنَّاسِ، وَاللّٰهُ بِكُلِّ شَيْءٍ عَلِيْمٌ. (النور ٢۴: ٣۵)

يقول الاستاذ الإمام:

"هذه السماء والارض، بل هذا الكون كله، هو عالم من الظلمات وبلدة الدياجير لشخص لا يؤمن بالله، أو يؤمن به لكنه لا يقر ويعترف بصفات الله وما تتقاضاه من الواجبات. فمثل هذا الشخص لا يستطيع أن يعرف من أين جاء هذا العالم، ولا يمكنه معرفة ما هو الغرض والغاية من وجوده.

وإنه لا يستطيع حتى أن يقضى بنفسه ما هو هدفه من وجوده هو. هل هو استبدادى وحر طليق فى هذا العالم، أم أنه مقيد ومقهور؟ هل هو مسؤول أم غير مسؤول؟ ما هو خير له وما هو شر بالنسبة له؟ هل يجب أن يتبع طريق الظلم والقمع أم طريق العدل؟ هل يجب أن يسعى وراء مصالحه ورغباته الخاصة أو يعمل لغرض أعلى ومقصد أسمى من ذلك؟ تعتمد الحياة الصحيحة والناجحة على الإجابة الصحيحة على هذه الاسئلة. لكن الشخص الذى لا يؤمن بالله لا يستطيع أن يجد الجواب والحل الصحيح لهذه الاسئلة.

إنه يتجول ويتيه مثل جاموس أعمى فى الظلام ويسقط فى النهاية فى هاوية الهلاك والموت ويصل إلى مصيره المحتوم. وأما من آمن بالله واعترف بصفاته الحقيقية، فإنه يحصل أيضا على نهاية هذا الكون ونهايته أيضا تتضح له. كما أنه تتنور له الإجابات على جميع الاسئلة التى لا يستطيع غير المؤمن بالله والمنكر له حلها أبدا.

ولهذا السبب، لا يبقى هذا العالم مظلما ولا بلدة دياجير بالنسبة له، فإن نور الإيمان ينير له كل شئ وكل جانب منه يتلمع ويضاء عليه. فالآن مهما كانت الخطوات التى يتخذها، يتخذها فى ضوء النهار كله، وفى أى اتجاه يسير فيه، فإن نور الإيمان بالله

يرشده. وقد أوضحت هذه الحقيقة فى الآية الكريمة : أن اللّٰه هو نور السماوات والارض.

ومن لديه هذا النور فهو فى النور وعلى الطريق المستقيم.

ومن يحرم من هذا النور يتيه فى عالم الظلمات، ولا يمكن لاحد آخر أن يعطيه النور.

’وَمَنْ لَّمْ يَجْعَلِ اللّٰهُ لَهٗ نُوْرًا فَمَا لَهٗ مِنْ نُّوْرٍ‘.“ (تدبر قرآن ۵/۴۰۹)

نعیم احمد بلوچ

حیاتِ امین

(سوانح مولانا امین احسن اصلاحی)

(16)

[صاحب ”تدبر قرآن“ کی وصیت کے مطابق
ان کے سوانح نگار نعیم احمد بلوچ کے قلم سے]

جماعت اسلامی پر تنقید کی ایک بڑی وجہ یہ تھی کہ مولانا مودودی نے پہلی دفعہ اسلامی حکومت کے قیام کو دینی فریضہ قرار دیا تھا۔ برصغیر ہی نہیں، بلکہ پوری دنیا میں اس سے پہلے اسلامی ریاست کے قیام کو دین کا بنیادی فریضہ قرار دینے کی کوئی نظیر نہیں ملتی تھی۔ اس وقت کے علما کے لیے دین کی یہ تعبیر بالکل اجنبی تھی۔ پھر طرہ یہ کہ اسی نقطۂ نظر کی بنیاد پر مولانا سید ابوالاعلیٰ صاحب مودودی نے اپنی معرکۃ الآرا کتاب ”تجدید و احیائے دین“ تصنیف کی۔ اس کتاب میں مولانا نے یہ موقف اختیار کیا کہ اس سے پہلے دین کے احیا کی جتنی بھی کوششیں ہو چکی ہیں، وہ اس فریضے کی انجام دہی کے بارے میں مکمل طور پر غافل رہی ہیں یا اسے وہ اہم مقام نہیں دیا گیا جس کا یہ فریضہ تقاضا کرتا ہے۔

اس کے ساتھ یہ بھی حقیقت تھی کہ نیا نقطۂ نظر ہونے کی وجہ سے ابھی علما اس پر درست پہلو سے تنقید بھی نہ کر سکے۔ وہ اسے غلط تو کہہ رہے تھے، لیکن اس کی کوئی مسکت اور ٹھوس دلیل ان کے پاس نہیں تھی۔ چنانچہ شروع میں جماعت اسلامی پر ہونے والے تنقیدیں بہت بودی اور مثبت استدلال سے خالی تھیں۔ مولانا اصلاحی کا زیر بحث مقالہ ''نئی فرد قرارداد جرم'' اسی پہلو سے لکھا گیا تھا کہ یہ تنقیدات بلاوجہ اور استدلال سے خالی ہیں۔ مولانا مودودی کی کتاب ''تجدید واحیائے دین'' پر مولانا منظور نعمانی نے جب تنقید کی تو مولانا اصلاحی نے اسے آڑے ہاتھوں لیا۔ اس تنقید کا ایک ایک لفظ پڑھنے کے قابل ہے۔ یہاں ہم اس کا ایک اہم اقتباس نقل کرتے ہیں:

''مولانا نے یہ نتیجہ مودودی صاحب کی غالباً ان تحریروں سے نکالا ہے جن میں انھوں نے امام غزالی، مجدد الف ثانی اور شاہ ولی اللہ صاحب وغیرہ کو مجدد اور مصلح تسلیم کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی بعض فروگزاشتوں پر تنقید بھی کر ڈالی ہے۔ مولانا (منظور نعمانی) کا مطلب یہ ہے کہ اگر ان کو مجدد اور مصلح مانتے ہو تو پھر ان کی باتوں اور ان کے کاموں میں مین میخ نکالنے کے کیا معنی اور اگر ان کے کاموں میں نقائص موجود تھے تو یہ مجدد کیسے ہوئے؟ اس کے معنی تو یہ ہوئے کہ خلافت راشدہ کے بعد سے تاریخ کے کسی دور میں بھی پورا دین لوگوں کے سامنے نکھر کر آ ہی نہ سکا کیونکہ دین کے نکھارنے والے تو یہی مجدد دین تھے اور تم ان کے کاموں میں کیڑے نکالتے ہو۔

مولانا یہ شبہ وارد کرنے کے بعد پوچھتے ہیں کہ اگر تمھارا موقف فی الواقع یہی ہے تو پھر وہ حدیث کہاں گئی جن میں حضور نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے خبر دی ہے کہ میری امت کا ایک گروہ ہمیشہ حق پر قائم رہے گا اور لوگوں کے پیدا کیے ہوئے بگاڑ کی اصلاح کرتا رہے گا۔ مولانا کا یہ معارضہ بادی النظر میں قوی معلوم ہوتا ہے۔ اس میں شبہ نہیں کہ اگر اس امت کے ہر دور میں ایک گروہ کے حق پر قائم رہنے کی خوش خبری موجود ہے تو غائب کا علم تو صرف اللہ کو ہے، لیکن دل یہی گواہی دیتا ہے کہ ابن تیمیہ، مجدد صاحب، شاہ ولی اللہ اور اس زمرہ کے دوسرے اکابرین ان شاء اللہ ضرور حق پر ہیں اور ان کی خدمت ان شاء اللہ ضرور تجدید دین میں شمار ہو گی۔ اس امر کو مان لینے کے بعد یہ بات کچھ دل میں کھٹکتی ہے کہ یہ لوگ بھی جو حدیث کے فحوا کے مطابق مصلح اور مجدد دین ہیں، دین کے معاملے میں غلطیاں کر جائیں۔ لیکن یہ شبہ بلا تامل دور ہو جاتا ہے کہ کسی شخص یا کسی گروہ کا حق پر ہونا یا اس کا مصلح و مجدد ہونا اس امر کو ہرگز

مستلزم نہیں ہے کہ وہ معصوم بھی ہو۔ عصمت خاصۂ انبیا ہے اور ان کے سوا کوئی نہیں ہے جو اس شرف سے ممتاز ہوتا ہو۔ انبیا کے سوا کسی شخص یا کسی گروہ کے متعلق یہ عقیدہ رکھنا کہ وہ معصوم ہے اور اس سے کوئی غلطی ممکن نہیں ہے، ایک سخت قسم کی ضلالت ہے۔ احادیث میں جس گروہِ مصلحین کے برابر پیدا ہوتے رہنے کی جو خبر دی گئی ہے، وہ صرف یہ ہے کہ وہ حق پر قائم رہیں گے اور لوگوں کے پیدا کیے ہوئے بگاڑ کی اصلاح کرتے رہیں گے۔ حق پر قائم رہنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ ایک شخص سے کوئی غلطی ہی صادر نہ ہو۔ اس کے لیے یہ کافی ہے کہ وہ متبع ہو اور طالب طریقۂ جاہلیت نہ ہو۔ ہو سکتا ہے کہ وہ کسی اجتہاد میں غلطی کر جائے، ہو سکتا ہے کہ وہ کسی امر کو مسلمانوں اور اسلام کے مصالح کے مطابق سمجھے، لیکن فی الواقع وہ اس کے خلاف ہو... یہ بھی ہو سکتا ہے کہ کسی خاص زمانے کے عقلی اور علمی تقاضے تہذیب نفس و تزکیۂ اخلاق کی کسی تدبیر کو احوال و ظروف کے موافق قرار دے دیں اور اس عہد کے مصلحین اس چیز کے اختیار کر لینے میں کوئی مضائقہ نہ پائیں اور بعد میں آنے والے اس کو اپنے احوال و ظروف کے ناموافق پا کر اس کو یک قلم بدل ڈالیں۔ یہ ساری باتیں ممکن ہیں اور ان میں سے ہر بات مصلحین اور اہل حق سے ہوئی ہے اور ہو سکتی ہے اور ان کا ہونا ذرا بھی اس کی شان مصلحت اور مجددیت میں فرق پیدا کرنے والی چیز نہیں ہے۔

حضرت ابو بکر صدیق سے بڑھ کر حق پر استوار کون ہو سکتا ہے، لیکن ان سے بھی غلطیاں صادر ہوئیں اور انھوں نے نام لے لے کر خود اپنی غلطیاں گنوائی ہیں کہ میں نے فلاں فلاں ایسے کام ایسے کر ڈالے جن پر مجھے افسوس اور ندامت ہے۔ کاش میں نے وہ کام نہ کیے ہوتے۔ اسی طرح انھوں نے فرمایا کہ فلاں فلاں تدبیروں کے اختیار نہ کرنے میں مجھ سے کوتاہی ہوئی اور مجھے اس بات کا بڑا پچھتاوا ہے کہ میں نے وہ کام کیوں نہ کیے۔

حضرت ابو بکر کی صدیقیت کے بعد فاروق اعظم کی فضیلت سے کون انکار کر سکتا ہے؟ ان سے زیادہ شیطان کے فتنوں سے کون محفوظ ہو سکتا ہے جن کا مرتبہ بتایا گیا کہ شیطان وہ راستہ ہی چھوڑ کر ہٹ جاتا ہے جدھر سے ان کا گزر ہوتا ہے۔ تاہم یہ واقعہ نہیں ہے کہ انھوں نے اسامہ (کے لشکر کی روانگی) کے معاملے میں، مانعین زکوٰۃ کے معاملے میں، قرآن جمع کرنے کے معاملے میں جو رائے قائم کی وہ خود ان کے ارشاد کے مطابق صحیح نہیں تھی۔ میں نے ان دونوں

بزرگوں کی غیر معمولی عظمت کی وجہ سے ان کا نام لے کر ذکر کیا ہے۔ مقصود یہ ہے کہ انھی پر دوسروں کو قیاس کیا جائے۔ امام مالک کے بارے میں کون شک کر سکتا ہے کہ وہ حق پر قائم رہنے والے اور دین قائم کرنے والے نہیں تھے، لیکن کیا آپ حضرات ان پر تنقید نہیں کرتے؟ حضرت امام شافعی کے ایک عظیم مصلح ہونے میں کون شک کر سکتا ہے، لیکن آپ کے عربی مدرسوں میں کیا روزانہ ان کی فقہ کے بجاے باقی فقہ نہیں پڑھائے جاتے؟ امام احمد بن حنبل کی جلالت مرتبہ اور ان کی شان مجددیت و مصلحت میں کسے اختلاف کی جرأت ہو سکتی ہے، لیکن کیا علماے دین نے ان کی ساری علمی تحقیقات اور ان کے تمام رجحانات کو درست مان لیا ہے؟ امام ابن تیمیہ اپنے زمانے کے مجدد اعظم تھے اور ان کے دشمن بھی ان کے اس مرتبے کا انکار نہیں کر سکتے تھے، لیکن خود مولانا منظور نعمانی نے ان کی سب سے زیادہ بلند پایا کتاب میں ناصبیت کی جھلک دکھا دی ہے۔ مذکورہ بالا بزرگان دین اور قابل اکابر ملت میں سے کون ہے جس کا ظاہر ''الحق'' ہونا ہمارے یہاں مختلف فیہ ہو، لیکن ان میں سے کسی کو بھی ہم معصوم نہیں مانتے۔ پھر اگر ان کو معصوم نہ ماننے سے ان کی عظمت و جلالت میں کوئی فرق واقع نہیں ہوتا۔ وہ بدستور مصلح اور ظاہر الحق باقی رہتے ہیں۔ ان کے ذریعے سے دین بھی نکھرتا ہے۔ ختم رسالت کا تقاضا بھی پورا ہوتا ہے اور حدیث کا منشا اور مبتدا بھی کسی خطرے میں نہیں پڑتا تو آخر شاہ صاحب اور مجدد صاحب پر تنقید کر دینے سے کیونکر قیامت ٹوٹ پڑے گی؟ امید ہے کہ ان سے جو فروگزاشتیں ہوئی ہوں گی، اللہ تعالیٰ ان کے حسنِ نیت کے بدلے میں ان کو معاف فرمائے گا''(99-103)

اس مضمون کا ایک حصہ تصوف کے بارے میں ہے۔ یہ معلوم حقیقت ہے کہ دبستان شبلی کے تمام اہل علم اس حوالے سے یہ نقطۂ نظر رکھتے ہیں کہ تصوف اسلام کے متوازی ایک دین ہے۔ اس موقف پر اس زمانے میں بھی سخت تنقیدیں نکلیں اور آج بھی بہت تنقید کی جاتی ہے۔ اس حوالے سے مولانا اصلاحی نے اسی مقالے میں بہت اعلیٰ طریقے سے ان ساری تنقیدات پر اپنا موقف بیان کیا ہے۔ یہاں ہم اس کا قدرے ایک طویل حصہ نقل کرتے ہیں:

''مولانا کا گمان ہے کہ جماعت اسلامی کے اہل قلم تصوف پر تنقید تو بڑی بے باکی سے کرتے ہیں، لیکن ان میں سے کسی کو تصوف کی معمولی ابتدائی باتوں کا بھی پتا نہیں ہے۔ مولانا (منظور

نعمانی) کا دعویٰ ہے کہ یہ بات وہ اپنے ذاتی تجربے اور ذاتی واقفیت کی بنا پر کہہ رہے ہیں۔ میرا خیال ہے کہ مولانا کی یہ راے نہایت غلط اندازے پر مبنی ہے۔ جماعت کے اندر سارے آدمی ایک ہی مذاق اور ایک ہی طبیعت کے نہیں ہیں۔ ممکن ہے جماعت کے بعض اہل علم کو تصوف سے کوئی خاص دل چسپی نہ ہو اور انھوں نے اس فن کو کتاب و سنت سے بے تعلق سمجھ کر سرے سے اس کو ہاتھ ہی نہ لگایا ہو، لیکن اس سے یہ قیاس کر لینا کہ جماعت کے اندر سب ایک ہی مذاق کے ہیں، صحیح نہیں۔ پھر یہ حقیقت بھی فراموش نہیں کرنی چاہیے کہ کسی فن کی قدر و قیمت کا اندازہ کرنے کے لیے یہ ضروری نہیں ہے کہ اس فن کی تمام اَلّم غَلّم چیزیں پڑھی جائیں، بلکہ اس مقصد کے لیے یہ کافی ہے کہ ان کی بعض امہات کتب تنقید کے ساتھ پڑھ لی جائیں۔ اگر ایک آدمی ذہین اور نقاد ہو تو اتنے ہی سے وہ پورے فن کی قدر و قیمت کا اندازہ لگا لیتا ہے اور اگر اس میں نقد کی صلاحیت نہ ہو تو وہ ایک چیز پر پوری زندگی کھپا کر بھی اس سے بالکل کورا ہی رہتا ہے۔'' (106-107)

تصوف کے حوالے سے مولانا اصلاحی کا اپنا کیا مطالعہ تھا؟ اس حوالے سے ان کا اپنا بیان بہت اہمیت کا حامل ہے۔ فرماتے ہیں:

''مجھے اپنی ذات کی نسبت یہ اعتراف ہے کہ میں نے اس فن (تصوف) کا کچھ زیادہ مطالعہ نہیں کیا تاہم اگر کوئی شخص یہ خیال کرتا ہے کہ میں نے اس فن کی کوئی چیز سرے سے پڑھی ہی نہیں ہے اور اس کی الف بے جانے بغیر ہی اس پر تنقید شروع کر دی ہے تو اس کا خیال صحیح نہیں ہے۔ میں نے اس فن کی معتبر کتابوں میں ''رسالہ قشیریہ'' کو بار بار پڑھا ہے۔ میں نے ابو طالب مکی کی ''قوتُ القلوب'' اس اہتمام کے ساتھ پڑھی ہے کہ میں معمولی تیاری سے اس کی خلافِ کتاب و سنت باتوں پر ایک مقالہ املا کرا کر دے سکتا ہوں۔ میں نے امام غزالی کی ''احیاء العلوم'' سبقًا سبقًا پڑھی ہے اور ایک زمانے میں یہ کتاب مجھے بہت محبوب رہی ہے اور اب بھی مجھے ادبی اعتبار سے پوری کتاب اور فکری اعتبار سے اس کے بعض مباحث سے بڑی دل چسپی ہے۔ میں نے علامہ ابن قیم کی ضخیم اور عظیم الشان کتاب ''مدارج السالکین'' دو مرتبہ نہایت اہتمام کے ساتھ حرف بہ حرف پڑھی ہے۔ علامہ ابن قیم کی ''الفوائد'' جو تصوف میں ہے، مجھے اس قدر پسند رہی ہے کہ میں ایک زمانے میں ایک خاص ترتیب کے ساتھ اہل ذوق احباب کو زبانی سنایا

کرتا تھا۔ شاہ صاحب کے بعض رسائل بھی میری نظر سے گزرے ہیں۔ کچھ دنوں ”مثنوی مولانا روم“ سے بھی دل چسپی رہی ہے۔

حافظ (سعدی شیرازی) کو تو میں نے بار بار نہایت ذوق سے پڑھا ہے اور چونکہ میرے استاد مولانا حمید الدین فراہی ان لوگوں کے بڑے مخالف تھے جو خواجہ صاحب کو مست بادہ انگور خیال کرتے تھے، اس لیے میں نے بھی خواجہ صاحب کے کلام کو کلامِ معرفت ہی کے پہلو کو سامنے رکھ کر پڑھنے کی کوشش کی ہے۔ مجھے فلسفے اور تصوف سے ایک زمانہ میں بڑی دل چسپی رہی ہے۔ انگریزی زبان کے واسطے سے میں نے اس کو اس قدر پڑھا ہے کہ اگر قران حکیم نے مجھے بچایا نہ ہوتا تو میں بہت سی گم راہیوں میں مبتلا ہو جاتا۔ میں نے یوگا کی بھی بعض کتابیں پڑھی ہیں اور ہمارے تصور میں اس کے جو اجزا شامل کیے گئے ہیں، میں ان کی نشان دہی کر سکتا ہوں۔

میں اس بات کو تسلیم کرتا ہوں کہ میرا مطالعہ اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ میں ایک پیر و مرشد بن جاؤں اور لوگوں کو تصوف کے اسرار و رموز بتانے شروع کر دوں، لیکن کیا یہ اس بات کے لیے کافی نہیں ہے کہ میں یہ فیصلہ کر سکوں کہ تصوف کا کتاب و سنت سے کوئی تعلق ہے یا نہیں ہے؟ اور ہمارے لیے کوئی مفید شے ہے یا مضر چیز ہے؟“(10)

خانقاہی نظام تربیت اور صوفیانہ طریقوں کے بارے میں مولانا اصلاحی کیا نقطۂ نظر رکھتے تھے، اس کا اظہار اس اقتباس سے ہوتا ہے:

”مولانا (نعمانی) نے دوسری بات یہ فرمائی ہے کہ تصوف کو اگر کوئی شخص کتابوں میں پڑھ بھی لے جب بھی کوئی فائدہ نہیں ہوتا۔ یہ دنیا کی ان حقیقتوں میں سے ہے جو الفاظ کے معنی جان لینے سے بھی ادراک کی گرفت میں نہیں آتیں، بلکہ یہ آدمی کو خود نصیب ہوتی ہیں یا جب آدمی کسی دوسری زندہ ہستی میں ان کا مشاہدہ کرتا ہے، تب کچھ سمجھ میں آتی ہیں۔

مولانا کے ارشاد کا مطلب یہ ہے کہ اگر ہم نے تصوف کا پوری تفصیل کے ساتھ مطالعہ بالفرض کیا بھی ہو تب بھی ہمیں اس کے متعلق زبان کھولنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے کیونکہ نہ تو ہمیں یہ چیز خود نصیب ہوئی ہے اور نہ ہم نے اس کا کسی زندہ ہستی میں مشاہدہ ہی کیا ہے۔ خود نہ حاصل ہونے کی وجہ تو غالباً یہ ہے کہ زعفران کی طرح تصوف کے پیدا ہونے کا ایک خاص علاقہ ہے۔ اس دائرے سے باہر اس کا اگنا ناممکن ہے۔ جو لوگ اس رقبۂ مخصوص میں بستے ہیں

بس انھی کے قلوب صافی میں یہ چیز اُگ سکتی ہے۔ باقی رہا کسی زندہ ہستی کا سوال جس کے اندر تصوف کی حقیقتوں کا مشاہدہ کیا جا سکے تو اس چیز کا کوئی امکان ہی باقی نہیں رہا کیونکہ مولانا کے بقول ایسی ہستی موجود نہیں رہی جس کی زندگی کے اندر اس کے جلوے دیکھے جا سکیں۔

اب کسے رہنما کرے کوئی

مجھے اس بات پر تعجب ہے کہ آخر تصوف ہی کی یہ خصوصیت کیوں ہے کہ اس کو بس کسی زندہ آدمی ہی کے اندر دیکھا جا سکتا ہے۔ اس کے بغیر اس کی حقیقت نہیں جانی جا سکتی۔ اگر ایک طالب حقیقت اللہ کی کتاب کو سمجھ سکتا ہے، اگر ایک سلیم الطبع آدمی رسول اللہ کی حدیثوں کو سمجھ سکتا ہے اور تصوف کے مدعیوں سے کہیں زیادہ بہتر طریق پر سمجھ سکتا ہے تو آخر تصوف ہی کو ایسے کیا سرخاب کے پر لگے ہوئے ہیں کہ ان کو نہیں سمجھا جا سکتا؟ اگر تصوف قرآن و حدیث کی چیزوں سے نکلا ہوا ہے تو اس کو سمجھ میں آنا چاہیے، لیکن اگر قرآن اور حدیث سے اس کو کوئی تعلق نہیں ہے تو پھر بہتر ہے کہ یہ نہ سمجھ میں آئے۔ ایک مسلمان کا اس چیز سے محروم ہی رہنا اچھا ہے جو قرآن اور حدیث سے بے تعلق ہے۔ ہمارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا ہے:

من حسن إسلام المرء تركه ما لا يعنيه.

”یہ آدمی کے اسلام کی خوبی ہے کہ وہ غیر متعلق باتوں میں نہ پڑے۔“

مولانا نے اس مضمون کے اس حصے میں اپنے بعض ذاتی تجربات کا بھی حوالہ دیا ہے۔ میں اپنے ذاتی تجربات کو لائق ذکر تو نہیں سمجھتا، لیکن مولانا اجازت فرمائیں تو میں بھی اپنا ایک ذاتی تجربہ عرض کرنے کی جسارت کرتا ہوں۔

میں نے آج تک جتنے آدمی بھی خانقاہی طریق پر تربیت کرنے والے دیکھے ہیں، ان میں سے ایک شخص بھی ایسا نہیں دیکھا جس میں، میں نے وہ باتیں محسوس کی ہوں جن کو مولانا تصوف کا خاصہ بتاتے ہیں۔ بعض کی ظاہری دین داری سے میں وقتی طور پر اگر متاثر بھی ہوا تو میں نے دیکھا کہ دوسرے پہلوؤں سے وہ بہت خام ہیں۔ میرے علم میں متعدد ایسے اشخاص بھی ہیں جو خانقاہی تزکیے سے پہلے نہایت معقول قسم کے آدمی تھے، لیکن خانقاہی تزکیے کے کورس سے گزرنے کے بعد وہ بالکل مصنوعی قسم کے آدمی بن کے رہ گئے۔ یہ عام آدمیوں کی بات نہیں کر

رہا، بلکہ ان لوگوں کی بات کر رہا ہوں جن کو بڑا سمجھا جاتا ہے۔ ہاں صرف ایک شخص کو دیکھا ہے جو ان تمام خصوصیت کا صحیح طور پر حامل تھا جو مولانا تصوف کے خصائص بتاتے ہیں، لیکن میں بالیقین جانتا ہوں کہ ان کے اندر یہ خوبیاں تصوف کی راہ سے نہیں آئیں، بلکہ تدبر قرآن اور اتباع سنت کی راہ سے آئی ہیں۔ (مولانا کا اشارہ امام حمید الدین فراہی کی طرف ہے) افسوس ہے کہ یہ ہستی بھی اُٹھ گئی ورنہ میں مولانا کو دکھاتا کہ تصوف کی دنیا سے باہر بھی ایسے ایسے اہلِ کمال پیدا ہوتے ہیں...

مجھے پوری طرح اطمینان ہو گیا ہے کہ تصوف ہمارے اس سلسلے میں ذرا بھی ضروری نہیں ہے۔ میرا خیال ہے کہ ایک آدمی اگر اقامت دین کی جدوجہد میں خلوص کے ساتھ لگ جائے تو اس راہ کی سرگرمیاں اور اس کے تجربات خود اس کو ان لوگوں سے کہیں زیادہ بہتر آدمی بنا دیتے ہیں جو ہماری خانقاہوں میں تیار ہوتے ہیں۔ میرے پاس اس دعوے کا نہایت ناقابل تردید ثبوت موجود ہے۔ جن حضرات نے مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کی تکفیر کے فتوے دیے ہیں، ان کے ناموں کی طویل فہرست پر نگاہ ڈالیے۔ آپ کو نظر آئے گا کہ ان میں ایک شخص بھی غالباً ایسا نہیں ہے جس نے خانقاہی طریق پر تربیت نہ پائی ہو۔ انھوں نے صرف تربیت ہی نہیں پائی، بلکہ ان میں سے بعض ایسے بھی ہیں جو ایک مدت دراز سے لوگوں کا تزکیہ بھی کر رہے ہیں اور ایک خلقِ کثیر تہذیبِ اخلاق اور اصلاح نفس کے ارادے سے ان کی طرف رجوع کرتی ہے۔ اس خصوصیت کی وجہ سے بجا طور پر ان حضرات سے یہ توقع کی جاسکتی تھی کہ ایک نہایت اہم قدم اٹھاتے ہوئے یہ حضرات کچھ ذمہ داری اور خوفِ آخرت کا ثبوت دیں گے، لیکن ان حضرات نے ایک خادم دین مسلمان کو کافر بنانے اور ایک خادم دین جماعت کو ضال و مضل ٹھہرانے کے لیے جس بے دردی کے ساتھ اس کے کلام کو توڑا مروڑا ہے، جس بددیانتی کے ساتھ اس کی عبارتوں میں تحریف کی ہے، جس عرق ریزی کے ساتھ اس کے ایمان پرور کلام میں کفر کے معنی پیدا کیے ہیں، جس کھینچا تانی کے ساتھ اس کی طرف وہ باتیں منسوب کی ہیں جن کا وہ تصور بھی نہیں کر سکتا اور جس ''شریفانہ'' زبان میں فتوے مرتب کیے ہیں، اس سے مجھے یہ یقین ہو گیا ہے کہ خانقاہی طریقِ تربیت آدمی کو بنانے کی بجائے اور زیادہ بگاڑ دیتا ہے۔

اس کے برعکس ان لوگوں کو دیکھیے جن پر خانقاہی تربیت کا پرچھاواں بھی نہیں پڑا ہے۔ میرا اشارہ مولانا ابو اللیث صاحب اور مولانا مودودی صاحب کی طرف ہے۔ ان حضرات نے جس تحمل اور وقار کے ساتھ اس ہنگامۂ تکفیر و تفسیق کا سامنا کیا ہے اور انتہائی رنجیدہ اور اشتعال انگیز رویے کے مقابلے میں جس صبر، جس شرافت لہجہ اور نظمِ غیظ اور عفو عن الناس کا مظاہرہ کیا ہے، کیا کوئی شخص اس کا انکار کر سکتا ہے؟ پھر بتائیے کہ اگر مودودی صاحب اور ابو اللیث صاحب آپ کے مزکیوں اور مذکاؤں کے مقابلے میں سخط و رضا، دونوں حالتوں میں، سچائی اور انصاف پر قائم رہنے میں بہتر آدمی ثابت ہو سکتے ہیں دراں حالاں کہ انھوں نے ایک دن بھی خانقاہی تحریک پر تربیت نہیں پائی ہے تو آخر یہ تصوف ہے کس مرض کی دوا؟ اور اس کو کس غرض کے لیے اختیار کیا جائے؟ اور پھر یہ فرمائیے کہ تصوف کا جو کاروبار اتنے وسیع پیمانے پر مدت ہاے دراز سے جاری ہے، لیکن خود آپ کے ارشاد کے مطابق آج ایک زندہ شخص بھی موجود نہیں ہے جس کو آپ تصوف کے نمونے کی حیثیت سے پیش کر سکیں تو آخر اس کاروبار کو مزید جاری رکھنے کا حاصل کیا ہے؟

آپ ہم سے یہ کہتے ہیں کہ دس سال کے تجربے کے بعد بھی تمھاری آنکھیں نہیں کھلیں؟ ہماری آنکھیں تو کھل چکی ہیں۔ ہم تو یہ دیکھ رہے ہیں کہ اس قلیل مدت میں جو حقیر خدمت اقامت دین کی انجام پائی ہے، اس نے آج ہزاروں انسان ایسے تیار کر دیے ہیں جو اپنے روزمرہ معاملات زندگی میں اس سے کہیں زیادہ خوفِ آخرت کا لحاظ رکھتے ہیں جتنا آپ کے مفتیان دین فتویٰ لکھنے میں رکھتے ہیں۔ برعکس اس تصوف کے، حاصل اس کا یہ ہے کہ آج ایک شخص کو بھی پیش نہیں کر سکتے جس پر آپ کو اطمینان ہو کہ یہ تصوف کی برکات کا نمونہ ہے۔ پھر یہ مدتوں کا لاحاصل تجربہ آخر آپ حضرات کی آنکھیں کیوں نہیں کھولتا؟“(107-115)

[باقی]

ترے حضور میں حرف و سخن کہاں، ساقی
یہ میرے اشک ہیں، اِن سے کلام پیدا کر

خیال و خامہ

جاوید احمد غامدی

اٹھ کہ یہ سلسلۂ شام و سحر تازہ کریں

اٹھ کہ یہ سلسلۂ شام و سحر تازہ کریں
عالمِ نو ہے، ترے قلب و نظر تازہ کریں
اِس زمانے کو بھی دیں اور زمانہ کوئی
پھر اٹھیں ولولۂ علم و ہنر تازہ کریں
تیری تدبیر سے نومید ہوئی ہے فطرت
راستے اور بھی ہیں، رختِ سفر تازہ کریں
شعلۂ طور اٹھے آتشِ فاراں ہو کر
پھر تری خاک میں پوشیدہ شر تازہ کریں
حرف و آہنگ نہ ہوں سوزِ دروں سے خالی
ہر رگِ ساز میں اب خونِ جگر تازہ کریں

اِسی فقیر کا یہ حلقۂ سخن ہے جہاں
عجب نہیں کہ ہوں فطرت کے رازداں پیدا

گفتگو: محمد حسن الیاس

سوالات: نجم سہروردی

تدوین و ترتیب: رانا معظم صفدر

پاکستان، امریکہ اور مسلمانوں کی نشاۃ ثانیہ

جناب محمد حسن الیاس سے ایک انٹرویو

(5)

[”غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، امریکہ“ کے ڈائریکٹر ریسرچ اینڈ کمیونیکیشن اور ”اشراق امریکہ“ (آڈیو) کے مدیر محمد حسن الیاس صاحب گذشتہ دنوں پاکستان گئے تو ”آف دا اسکول“ پوڈکاسٹ کے میزبان نجم سہروردی نے اُن کا ایک تفصیلی انٹرویو ریکارڈ کیا۔ اِس انٹرویو میں اُن سے پاکستان اور مسلمانوں کو درپیش مختلف مسائل پر سوالات کیے گئے۔ حسن الیاس صاحب نے اُن کے جواب میں پوری وضاحت سے اپنے موقف کو پیش کیا۔ یہ انٹرویو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔ اِسے ضروری ترتیب و تدوین اور حک و اضافے کے بعد ”اشراق امریکہ“ کے قارئین کے لیے شائع کیا جا رہا ہے۔]

امریکہ کے معاشرے میں بے راہ روی

سوال: آپ ہمارے معاشرے سے بہ خوبی آگاہ ہیں، اور اب آپ امریکہ میں مقیم ہیں۔ ہمیں جو ایک بڑا مسئلہ امریکی معاشرے میں نظر آتا ہے، اسے صرف مذہبی نقطۂ نظر سے ہی نہیں، بلکہ اخلاقی اور فطری تناظر میں بھی دیکھا جائے تو اسے ہم سادہ الفاظ میں جنسی بے راہ روی کہہ سکتے ہیں۔ مزید یہ کہ وہاں جو نئےGender Studies اورGender roles کے حوالے سے رجحان بڑھتا جا رہا ہے، وہ بھی بہ طور معاشرتی چیلنج قابل غور ہے۔ ان سے صرف مسلمان ہی نہیں، بلکہ یہودی اور عیسائی بھی پریشان ہیں۔ اس پر یہ کہہ دینا کہ یہ آزادی اظہار رائے اور فرد کا ذاتی معاملہ ہے، کیا کافی ہے، جب کہ محسوس یہ ہوتا ہے کہ یہ مسائل ہی ان کی وجہ سے پیدا ہو رہے ہیں۔ اس پر آپ کیا کہتے ہیں؟

جواب: یہ بات ایک حد تک ٹھیک ہے، وہاں ان مسائل کی بنیادی وجہ آزادیfreedom ہے۔ لیکن اس کو سمجھنے کی ضرورت ہے کہ آزادی کی قدر ان کے ہاں ایسی اہمیت رکھتی ہے جس طرح ہماری اسلامی تہذیب میں عبودیت ہے، یعنی جس طرح ہم اپنی تہذیب میں جس قدر کو بنیاد مانتے ہیں وہ خدا کی بندگی ہے، بالکل ایسے ہی مغرب نے اپنے ہاں جو تہذیبی اقدار قائم کی ہیں، ان میں ان کے لیے سب سے بڑی قدر آزادی (freedom) ہے۔

ان کے ہاں، آزادی سے مراد یہ ہے کہ کوئی بھی شخص دوسرے پر جبر یا تسلط نہ کرے، نہ کسی کی جان، مال یا عزت پر زیادتی کرے۔ ہر فرد کا حق ہے کہ وہ ریاست میں اپنے حقوق کی حفاظت کرے اور اس کا تحفظ کیا جائے۔ اس معاملے میں ان سے غلطی یہ ہوئی کہ جب آزادی کو محض ایک فلسفہ بنا لیا جائے اور اسے کسی مذہبی یا اخلاقی رہنمائی کے بغیر اپنایا جائے تو اس کا نتیجہ معاشرتی بے راہ روی کی صورت میں ہی نکلے گا، اور یہی چیز مغرب میں نظر آ رہی ہے۔

مغرب میں مسیحی اقدار اور مذہب کا گہرا تعلق موجود ہے اور یہ بات شاید ہمیں باہر سے نظر نہ آئے۔ امریکہ میں خاندان کی بہت اہمیت ہے، اسی طرح وہاں لوگ باقاعدگی سے چرچ بھی جاتے ہیں، جیسے میں ٹیکساس میں رہتا ہوں اور میرے محلے میں تقریباً چالیس کے قریب چرچ ہیں، جہاں ہر ہفتہ اور اتوار کو لوگ عبادت کے لیے جمع ہوتے ہیں۔

سوال: تو کیا امریکہ چرچ واقعی فعّال (functional) ہیں؟ کیونکہ ہمارے یہاں تو اخبارات میں پڑھتے ہیں کہ چرچ بند ہو رہے ہیں، ان کی جگہ پب یا شادی ہال بن رہے ہیں۔

جواب: امریکہ میں چرچ بالکل functional ہیں اور ان میں رش بھی بہت زیادہ ہوتا ہے۔ یہ تصور کہ چرچ ختم ہو رہے ہیں یا فروخت ہو رہے ہیں، زیادہ تر یورپ سے متعلق ہے، جہاں مذہبی رجحان کم زور پڑ چکا ہے۔ امریکہ کی صورت حال اس سے مختلف ہے۔ یہاں ایک پوری 'بائبل بیلٹ' موجود ہے، جو کئی ریاستوں پر مشتمل ہے، اور ان کی تہذیبی شناخت مذہبی بنیادوں پر قائم ہے۔ وہاں، اب بھی خاندان کا نظام بہت مضبوط ہے۔ میری اہلیہ ایک تھراپسٹ اور ماہر نفسیات ہیں، انھوں نے وہاں براہ راست اس معاشرے کا مشاہدہ کیا، انھوں نے دیکھا کہ خاندانی اقدار، والدین اور بچوں کے تعلقات، اور بچوں کی تربیت پر بہت زور دیا جاتا ہے۔

تاہم، یہ بات درست ہے کہ امریکہ میں بچوں کو 18 سال کی عمر کے بعد خود مختار ہونے کی ترغیب دی جاتی ہے، لیکن اس کا مطلب والدین کو نظر انداز کرنا نہیں ہے۔ یہ نظام بچوں کو مالی طور پر ذمہ دار بننے، چیلنجز کا سامنا کرنے، اور اپنی شخصیت کو نکھارنے کی طرف لے جاتا ہے۔ اسی طرح بوڑھے والدین کے لیے جو نگہداشت کا نظام ہے، وہ بھی بہت موثر ہے۔ وہاں Old homes کو ایک ضرورت کے طور پر دیکھا جاتا ہے۔ اس سے مراد یہ ہے کہ اولاد اپنی مصروفیات میں ہیں اور والدین کی بہتر دیکھ بھال کے لیے یہ آپشن اختیار کیا جاتا ہے۔ یہ ہمارے یہاں کے تصورات سے بہت مختلف ہے کہ وہاں مجبور اور بے بس والدین کو ان اداروں کے رحم و کرم پر چھوڑ دیا جاتا ہے۔

باقی رہی بات وہاں پر موجود جنسی بے راہ روی کی، اس میں بنیادی چیز امریکہ میں آزادی کو بہ طور ایک قدر چونکہ مانا جاتا ہے، اس لیے وہاں ہر فرد اپنے فعل کے لیے خود مختار ہے۔ اور یہی رویہ LGBTQ کمیونٹی کے حقوق یا ہم جنس پرستی کے حوالے سے بھی نظر آتا ہے۔ وہاں کی سپریم کورٹ کے فیصلوں میں بھی ان کی آزادی کے تصور کو مرکزی حیثیت دی گئی ہے۔ لیکن اس آزادی کے باوجود، مذہبی اور سماجی اقدار کی جڑیں بہت گہری ہیں، جن کا ہم اکثر ادراک نہیں کر پاتے۔

سوال: یہی تو Individualism ہے۔ کیا امریکہ میں ایسا نہیں ہے؟

جواب: جی، امریکہ میں بھی Individualism ہے۔ اگر اسے ایک مسئلے کے طور پر دیکھا

جاتا تو ہمارے یہاں کئی طرح کے مسئلے موجود ہیں، بلکہ ہر معاشرے میں کسی نہ کسی طرح کے مسائل پائے جاتے ہیں۔ میرے نزدیک، دنیا کے مسائل کو مخصوص علاقوں کے تناظر میں دیکھنے کے بجاے انسانیت کے مشترکہ مسائل کے طور پر دیکھنا چاہیے۔ اور یہ بات سمجھ لینی چاہیے کہ ہر انسان اور ہر معاشرہ غلطیوں سے سیکھتا ہے۔

میری راے میں یہ رویہ ٹھیک نہیں ہے کہ ہم مغربی معاشرے کی برائیاں ایسے بیان کریں، گویا ہمارے اپنے معاشرے میں کوئی مسئلہ موجود نہیں۔ مثال کے طور پر ہمارے اپنے معاشرے میں اصل مسئلے سے بڑا مسئلہ یہ بن جاتا ہے کہ ہم شرمندگی یا معاشرتی دباؤ کی وجہ سے ہراسمنٹ، جنسی زیادتی یا خاندانی مسائل کو رپورٹ نہیں کرتے، جب کہ یہ مسائل ہمارے گلی محلوں، دکانوں پر کام کرنے والے بچوں اور گھریلو زندگی میں بھی موجود ہیں۔ اسی طرح ہمارے یہاں طلاق کی شرح مسلسل بڑھ رہی ہے، اور خاندانی اقدار کو درپیش چیلنجز شدید ہوتے جا رہے ہیں۔ اس لیے یہ سمجھنے کی ضرورت ہے کہ ہر معاشرہ اپنے اندر کئی مسائل اور چیلنجز رکھتا ہے، وہ انسانیت کے مسائل ہیں، نہ کہ مشرق یا مغرب کے۔ اگر ہم مشرق و مغرب کو بانٹ کر دیکھیں گے تو صرف تنقید کی نفسیات میں مبتلا ہو جائیں گے۔ مغرب اپنی غلطیوں پر غور کرتا ہے اور بہتری کی کوشش کرتا ہے۔ ہمیں بھی ان کی اچھی چیزوں سے سیکھ کر، اپنی اقدار کو مضبوط بنانا چاہیے۔

انسان ہمیشہ pendulum کی طرح ایک انتہا سے دوسری انتہا کی طرف جاتا ہے۔ ہر معاشرہ اپنی جگہ پر مسائل اور خوبیوں کا مجموعہ ہے، لیکن جو بنیادی انسانی اقدار ہیں، ان میں کوئی موازنہ نہیں کیا جا سکتا۔ ہمیں ان اقدار پر توجہ مرکوز کرنی چاہیے۔

[باقی]

شاہد محمود

خبرنامہ ”المورد امریکہ“

[دسمبر 2024ء]

”میزان“ کا عربی زبان میں ترجمہ

کچھ عرصہ قبل غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، امریکہ نے جاوید احمد غامدی صاحب کے افکار کو عالم عرب سے متعارف کرانے کے لیے اُن کی کتابوں کے عربی تراجم کا سلسلہ شروع کیا تھا، جس کا آغاز ان کی کتاب ”الاسلام“ اور ”مقامات“ کے عربی زبان میں تراجم سے ہوا تھا۔ حال ہی میں معروف عالم دین اور محقق غطریف شہباز ندوی صاحب نے غامدی صاحب کی کتاب ”میزان“ کا عربی ترجمہ بھی مکمل کر لیا ہے۔ ”میزان“ کا عربی ایڈیشن اشاعت کے لیے تیاری کے مراحل میں ہے۔ عربی قارئین کے لیے یہ کتاب جلد ہی دستیاب ہو گی۔

شارجہ انٹرنیشنل کتاب میلے میں غامدی سینٹر کا بُک اسٹال

گذشتہ ماہ شارجہ میں ہونے والے انٹرنیشنل کتاب میلے میں غامدی سینٹر نے شرکت کی اور کتابوں کا ایک اسٹال لگایا۔ لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے اس بُک اسٹال کا وزٹ کیا اور کتابیں خریدیں۔ کتاب میلے کی اختتامی تقریب میں حمزہ علی عباسی صاحب نے ادب، ایمان اور خود شناسی

پر گفتگو بھی کی۔

حمزہ علی عباسی صاحب کی کتاب کی تقریب رونمائی

نومبر 2024ء میں پاکستان ایسوسی ایشن دبئی نے حمزہ علی عباسی صاحب کو مدعو کیا، جہاں انھوں نے غامدی سینٹر کے زیر اہتمام شائع ہونے والی اپنی کتاب ”My Discovery of God, Islam & Judgement Day“ کی تقریب رونمائی میں شرکت کی۔ یہ تقریب نیاز مسلم لائبریری میں منعقد ہوئی۔ انھوں نے اپنی کتاب کا ایک نسخہ لائبریری کو تحفے میں دیا تاکہ یہ اس کے قیمتی مجموعے میں شامل ہو سکے۔

”حدیث: قرآن و سنت کا بیان یا اُن پر اضافہ“

منظور الحسن صاحب نے اپنے اس مضمون میں حدیث کے بارے میں غامدی صاحب کے موقف کو بیان کیا ہے۔ دین کے ماخذ اور سنت کی تعریف بیان کرنے کے بعد لکھتے ہیں کہ حدیث میں عقائد کا بیان بھی ہے اور اعمال کا بھی، مگر یہ بیان اُنھی عقائد و اعمال کی شرح و فرع اور تفہیم و تبیین پر مبنی ہے، جو قرآن میں مذکور اور سنت میں جاری ہیں۔ اِس میں جو شرعی احکام نقل ہوئے ہیں، اُن کی نوعیت نئے احکام کی نہیں، بلکہ قرآن و سنت کے احکام کی تشریح و تعبیر اور اُن پر آپ کے عملی نمونے کی ہے۔ چنانچہ قرآن و سنت کے احکام بھی دین ہیں اور حدیث میں نقل اُن کی شرح و فرع، تفہیم و تبیین اور اُن پر عمل کے لیے آپ کا اسوۂ حسنہ بھی دین ہے۔ یہ مضمون ”اشراق امریکہ“ کے نومبر 2024ء کے شمارے میں پڑھا جا سکتا ہے۔

”رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت“

حسن الیاس صاحب نے اپنے اس مضمون میں انبیا کی دعوت کے دائرے اور ان کی ہدایت کے آفاقی اثرات کے حوالے سے مسلمانوں کے عمومی موقف کو بیان کرتے ہوئے قرآنی دلائل سے اس دعوے کا رد بھی کیا ہے کہ تمام انبیا اپنی اپنی قوموں میں مبعوث کیے گئے اور اُن کی تعلیمات اُنھی کی رعایت سے تھیں، لہٰذا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی دعوت بھی عربوں ہی کے

ساتھ مخصوص ہے۔ لکھتے ہیں کہ انبیا کی تعلیمات اور دعوت کے مشمولات اپنی اصل کے اعتبار سے زمان و مکان کی قید سے آزاد اپنے وجود میں ایک عالم گیر پیغام، آفاقی صداقت اور تمام انسانوں کے لیے ہدایت کا منبع ہوتے ہیں۔ چنانچہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی بعثت اور قرآن کا پیغام پوری انسانیت کے لیے ہے۔ یہ مضمون ''اشراق امریکہ'' کے نومبر 2024ء کے شمارے میں ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

غامدی سینٹر کی آن لائن خانقاہ

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام جاری آن لائن خانقاہ میں معز امجد صاحب ہر ہفتے اصلاحِ نفس کے پہلو سے ایک نشست منعقد کرتے ہیں، جس میں لوگوں کے نفس کی اصلاح اور تربیت کے حوالے سے مختلف موضوعات کو زیر بحث لایا جاتا ہے اور اس سے متعلق لوگوں کی طرف سے پوچھے گئے سوالوں کے جواب دیے جاتے ہیں۔ گذشتہ ماہ اس سلسلے کی منعقد ہونے والی نشستوں میں زیر بحث آنے والے چند اہم نکات یہ ہیں: ''ایمان و عمل صالح''، ''اپنے ایمان پر غور و فکر کی ترغیب''، ''حقیقی ایمان درست عمل پر ابھارتا ہے''، ''اپنے محرکات کا فہم'' اور ''ایمان اور توہمات میں فرق''۔ آن لائن خانقاہ کی ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہے۔

''اسلام اسٹڈی سرکل''

نومبر 2024ء میں شہزاد سلیم صاحب نے ''اسلام اسٹڈی سرکل'' پروگرام میں قرآن مجید، حدیث اور بائیبل کے جن موضوعات پر بات کی، ان کے عنوانات بالترتیب یہ ہیں: ''اللہ کی رسی''، ''شفقت دکھانا'' اور ''والدین کا احترام''۔ مزید برآں، نشست کے آخر میں ''میرا رول ماڈل'' کے موضوع پر گفتگو کی گئی اور زیر بحث آنے والے موضوعات سے متعلق پوچھے جانے والے سوالوں کے جواب دیے گئے۔ اس نشست کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

”تفہیم الآثار“ سیریز

غامدی سینٹر کے زیر اہتمام ”تفہیم الآثار“ سیریز کے زیر عنوان گذشتہ ماہ منعقد ہونے والے پروگراموں میں تلاوت قرآن کے دوران میں صحابۂ کرام پر طاری ہونے والی خوف و خشیت کی کیفیت کے حوالے سے آثار کا مطالعہ کیا گیا۔ مزید بر آں، ”قرآن مجید سیکھنے کی ترغیب اور اس کا صحیح مفہوم“ اور ”روز قیامت قرآن مجید کی سفارش کے حق دار“ جیسے اہم نکات پر بھی گفتگو کی گئی۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر ملاحظہ کی جا سکتی ہے۔

”البیان“ کی انگریزی زبان میں تدریس

گذشتہ ماہ شہزاد سلیم صاحب نے غامدی صاحب کی تفسیر ”البیان“ میں سے سورۂ آل عمران کی آیات 180 تا 200 اور سورۂ نساء کی آیات 1 تا 22 کا انگریزی زبان میں درس دیا۔ ان نشستوں کی ریکارڈنگ غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر موجود ہے۔

”عدالتِ الٰہی میں پیغمبر کا مقدمہ“

ذکوان ندوی صاحب نے اپنے اس مضمون میں قرآن مجید سے غفلت و اعراض برتنے والوں اور اس کی تعلیمات کو پس پشت ڈالنے والوں کی بد بختی اور ان کے بارے میں اللہ کی سخت وعید کو بیان کیا ہے۔ لکھتے ہیں کہ قرآن مجید کو کتاب مہجور بنانے والوں کے خلاف روز قیامت نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم خود ان کے اس جرم کی گواہی دیتے ہوئے اللہ کے سامنے ان کی شکایت درج کرائیں گے اور کتاب اللہ کے سوا جن چیزوں پر آج ہم نے اپنا سارا وقت اور توانائی صرف کر رکھی ہے، ان کے ذریعے سے ہم خود پیغمبر کی طرف سے کیے جانے والے مقدمے کی تردید نہیں کر سکیں گے۔ یہ مضمون ”اشراق امریکہ“ کے نومبر 2024ء کے شمارے میں پڑھا جا سکتا ہے۔

”اصول و مبادی“

شہزاد سلیم صاحب ہر ماہ ”میزان“ کے مختلف موضوعات پر انگریزی زبان میں لیکچرز ریکارڈ کراتے ہیں۔ نومبر 2024ء میں شہزاد سلیم صاحب نے میزان لیکچرز سیریز کے تحت ”اصول و

مبادی“ کے موضوع پر انگریزی زبان میں دو لیکچرز ریکارڈ کرائے۔ ان لیکچرز کی ریکارڈنگ کو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھا جا سکتا ہے۔

دینی آرا پر مبنی فتاویٰ کا اجرا

شریعت کے قانونی اطلاقات کے حوالے سے لوگ اکثر غامدی سینٹر آف اسلامک لرننگ، امریکہ سے رابطہ کرتے ہیں۔ انھیں نکاح و طلاق، وراثت (inheritance) اور بعض دیگر معاشی اور معاشرتی پہلوؤں سے اطلاقی آرا کی ضرورت ہوتی ہے۔ گذشتہ ماہ اسی نوعیت کی مختلف ضرورتوں کے تحت 4 فتوے جاری کیے گئے۔ انھیں جناب جاوید احمد غامدی کے فکر کی روشنی میں حسن الیاس صاحب نے جاری کیا۔

شہزاد سلیم صاحب کے آن لائن نجی مشاورتی سیشن

شہزاد سلیم صاحب ہر ماہ لوگوں سے آن لائن نجی مشاورتی سیشن کا اہتمام کرتے ہیں۔ ان سیشنز میں لوگ اپنے مختلف ذاتی اور خاندانی نوعیت کے مسائل میں شہزاد سلیم صاحب سے مشاورت کرتے ہیں۔ گذشتہ ماہ اس سلسلے کے 30 سے زائد سیشنز ہوئے۔ ان سیشنز میں لوگوں نے شہزاد سلیم صاحب سے والدین کو درپیش مشکلات اور نوعمری کے مسائل کے حل کے لیے مشاورت کی۔

”علم و حکمت: غامدی کے ساتھ“

دنیا نیوز پر نشر ہونے والے غامدی صاحب کے ہفتہ وار پروگرام ”علم و حکمت: غامدی کے ساتھ“ میں نومبر 2024ء میں ہونے والے پروگراموں میں ”علما کے درجات اور خصوصیات“ کے موضوع پر 3 پروگرام نشر ہوئے۔ مزید برآں، ناظرین کی طرف سے موصول ہونے والے سوالات کے جواب بھی دیے گئے۔ ان پروگراموں میں زیر بحث آنے والے سوالوں میں سے چند اہم سوالات یہ ہیں: ”کسی معلم کا محقق بننے کی خواہش کرنا کیسا ہے؟“، ”دین کا واعظ بننے کے لیے کیا کرنا ضروری ہے؟“ اور ”کیا واعظ بننے کے لیے دنیاوی آسایشوں کو ترک کرنا ضروری

ہے؟'' ان پروگراموں کی ریکارڈنگ ادارے کے یوٹیوب چینل پر دیکھی جا سکتی ہے۔

Ask Dr. Shehzad Saleem

یہ سوال وجواب کی لائیو ماہانہ نشست ہے، جس میں ڈاکٹر شہزاد سلیم لوگوں کے ذہنوں میں اٹھنے والے مختلف دینی، اخلاقی اور معاشرتی موضوعات سے متعلق سوالوں کے جواب دیتے ہیں۔ اس نشست میں لوگ اردو اور انگریزی، دونوں زبانوں میں اپنے سوال پوچھ سکتے ہیں۔

ڈاکٹر شہزاد سلیم کے مختلف موضوعات پر لیکچرز کی ریکارڈنگ

شہزاد سلیم صاحب ہر ماہ دینی، اخلاقی اور سماجی موضوعات پر انگریزی زبان میں لیکچرز ریکارڈ کراتے ہیں۔ نومبر 2024ء میں انھوں نے جن موضوعات پر لیکچرز ریکارڈ کرائے، وہ یہ ہیں: ''قرآن کے فراموش شدہ اسباق'' اور ''انسانیت''۔ ان لیکچرز کو غامدی سینٹر کے یوٹیوب چینل پر دیکھا جا سکتا ہے۔